مطالعہ افکارِ مغرب

باب اجتہاد

علمیاتی تعصب کے مطالعہ کی ابتداء

مصنف
ڈاکٹر عبدالوہاب المسیری

مترجم
اوصاف احمد

عکس
AKSPUBLICATIONS

297.3
57 ب ع
16155

Marfat.com

Marfat.com

باب اجتہاد

علمیاتی تعصب کی مطالعہ کی ابتداء

مصنف

عبدالوہاب المسیری

مترجم

اوصاف احمد

M-32931
DATA ENTERED

عکس
AKSPUBLICATIONS

Marfat.com

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ ادارہ کتاب عکس پبلی کیشنز سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا، اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کاروائی کا حق محفوظ ہے۔

297.31
ب574
141002

نام کتاب باب اجتہاد

مصنف: عبدالوہاب المسیری

مترجم اوصاف احمد

سن طباعت 2018ء

تعداد 500

قیمت 200/-

Copyright©2018 - 1st Edition

عکس

AKSPUBLICATIONS

Book Street, Data Darbar Market, Lahore.
Ph:042-37300584,Cell # 0300-4827500-0348-4078844
E-mail:publications.aks@gmail.com

مندرجات

پیش لفظ ---------------------------- ڈاکٹر محمد منظور عالم

1- تمہید ---------------------------- 7

2- تعصب کی تعریف ---------------------------- 12

3- مغربی ثقافتی نظام کے حق میں تعصب ---------------------------- 24

4- مغربی ثقافتی نظام افکار کا غلبہ ---------------------------- 33

5- مغربی نظامِ افکار کے حق میں تعصبات ---------------------------- 41

6- مادّی علمیاتی نظام افکار میں تعصب کے تعصبات ---------------------------- 57

7- مادّی علمیاتی نظام افکار میں تعصب کے مظاہر ---------------------------- 63

8- تعصب پر قابو پانے کے طریقے ---------------------------- 78

9- ایک مجوزہ متبادل عملیاتی نظام ---------------------------- 103

10- ممکنہ متبادل سائنس ---------------------------- 109

Marfat.com

پیش لفظ

یہ کتاب ایک نہایت مشکل لیکن اہم موضوع کے بارے میں ہے۔اس موضوع کا تعلق فلسفہ کی ایک شاخ سے ہے جسے علمیات یا انگریزی میں EPISTEMOLOGY کہتے ہیں۔اس علم کا مقصد اس بات کی تفتیش کرنا ہے کہ علم کی ماہیت کیا ہے۔اس کے مناسب طریقے کیا ہیں اور ان طریقوں کی حدود کیا ہیں۔

آج کل بھی علمی ترقی کے بلند بانگ دعوں کے علی الرغم اور ان امور کی اہمیت کے باوجود ان پر کماحقہ' توجہ نہیں دی جاتی۔اسلامی تاریخ میں علماء کو ابتداء میں ہی ان سوالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔اسلامی علماء نے ان سوالات کے جو جوابات دیئے۔حقیقت کی تفتیش کے لئے جو طریقہ کار مرتب کئے، علم کی جو منہاج طے کیا۔ان کا مطالعہ 'اصول الفقہ' کے نام سے کیا جاتا ہے۔

آج کل علم کی ایک اور شاخ منہاجیات (Methodology) کے نام سے سامنے آگئی ہے۔مختلف سماجی علوم میں اصل مسائل سے بحث کرنے سے پہلے منہاجی مسائل (Methodological Issues) پر گفتگو کی جاتی ہے۔عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ فطری علوم میں تعصب کا دخل نہیں کیونکہ ان کی بنیاد تجربہ پر ہے اور تجربہ کے ذریعہ ان کی صداقت کو پرکھا جاسکتا ہے۔مثلاً طبیعات کا ایک مسلّم قانون قانونِ ثقل ہے کہ زمین کے اندر کشش ثقل پائی جاتی ہے۔اگر کوئی چیز بلندی سے گرائی جائے تو وہ اوپر جانے کے بجائے نیچے ہی آئے گی۔اس کی وجہ کشش ثقل ہے۔یہ قانون زمان و مکان کی تبدیلیوں سے ماورا ہے۔اگر سیب کے درخت سے ایک سیب گرا تو خواہ ایسا لندن میں ہوا ہو یا کشمیر میں، افریقہ میں ہوا ہو یا ہماچل پردیش میں، سب جگہ ایک جیسے سیب کا نتیجہ ایک جیسا ہی ہوگا۔جگہ کے فرق سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اسی طرح قانون ثقل پر زمانے کے فرق سے بھی کوئی اثر نہیں پڑتا۔ہزاروں سال پہلے بھی زمین کی

Marfat.com

کشش ثقل کے باعث چیزیں اوپر سے نیچے آتی تھیں۔اب بھی ایسا ہی ہوتا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ تاہم تمام فطری علوم میں تعصب کا دخل نہ ہوا ایسا نہیں ہے۔مثال کے طور پر ایک سائنس داں تجربہ گاہ میں اپنے تجربہ کے ذریعہ یہ معلوم کرتا ہے کہ مادہ ایٹم کے چھوٹے چھوٹے ذرّوں سے مل کر بنا ہے لیکن ان میں کوئی ترتیب نہیں پائی جاتی۔اس سے اگر وہ یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ کائنات بے ترتیب اور لامقصدی ہے تو دوسری طرف اس تجربہ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی ممکن ہے کہ ہماری مشاہدہ کی صلاحیت محدود ہے اور شائد ابھی تک ہم علم کے اس درجہ تک نہیں پہونچے ہیں کہ اشیاء کی حقیقت کو مکمل طور پر دریافت کر سکیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ سائنس داں کے فلسفیانہ خیالات، اخلاقی اقدار اور یہاں تک کہ اس کے تعصبات بھی فطری علوم میں بھی ابتدائی درجہ میں ہی داخل ہو جاتے ہیں۔

منہاجیات میں تعصب اور اصطلاحات کے مسئلہ سے چار دانگ عالم کے علماء اور فضلاء کو سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن تیسری دنیا کے دانش وروں کو اس کا خصوصی سامنا ہے۔کیونکہ وہ ایک ایسی دنیا میں زندہ ہیں جہاں کا ثقافتی ماحول، اقدار، اور تہذیب مغرب سے درامد شدہ ہے۔یہ تہذیبی اقدار ہمارے اردگرد کی زندگی میں سما گئی ہیں اور بغیر کسی شعوری کوشش کے ان کا ادراک بھی مشکل ہے۔ہمارے تعلیمی اداروں میں، ہماری یونیورسٹیوں میں، ہماری تجربہ گاہوں میں، شعوری یا غیر شعوری طور پر انہیں علمیاتی نظاموں کی پیروی کی جاتی ہے۔جن کی داغ بیل مغرب میں ڈالی گئی ہے۔جب مغرب کے اساتذہ ''ترقیاتی نفسیات'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہمارے علماء اور سائنس داں بھی ''ترقیاتی نفسیات'' کا راگ الاپنے لگتے ہیں۔جب وہ ''اطلاقی نفسیات'' کی اصطلاح ایجاد کرتے ہیں تو ہمارے علماء کو بھی ہر درد کا درماں ''اطلاقی نفسیات'' میں ہی نظر آنے لگتا ہے۔یہاں ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارا مقصود مغرب کی مذمت نہیں ہے بلاشبہ مغربی علماء، فلسفیوں، سائنس دانوں نے بھی انسانیت کی بڑی خدمت کی ہے، نئے علوم دریافت کیے ہیں۔نئی اصطلاحات کو جنم دیا ہے، تحقیق وجستجو کے نئے طریقے دریافت کیے ہیں، انسانیت کے دکھ درد کا درماں تلاش کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے لیکن انہوں نے یہ سب کچھ اپنے تہذیبی دائرے میں رہ کر کیا ہے اور اس میں ان کی تہذیبی اقدار اور اس کا تعصب بھی شامل ہے۔

ضروری ہے کہ ان تمام چیزوں کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔اور خذ ما صفا ودع ما کدر کے اصول

Marfat.com

کے مطابق چھان پھٹک کی جائے۔ یہ پتہ لگایا جائے کہ مغرب کے علمی خزانے میں کیا ہے جو عام (Universal) اور زمان ومکان سے ماوراہے، جسے عام انسانی تہذیبی ورثہ میں شامل سمجھنا چاہئے اور کیا ہے جس کی حیثیت صرف مقامی ہے اور جس کی جڑیں مغرب کی تہذیبی روایت میں دور تک پیوست ہیں۔ ایسے علمی نظریات کا اطلاق دوسرے سماجوں اور دوسری تہذیبوں میں نہ صرف مشکل ہے بلکہ گمراہ کن بھی ہے۔

انہیں احساسات کے پیش نظر واشنگٹن کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ نے مشہور عرب دانشور ڈاکٹر عبدالوہاب المسیری کی مرتب کردہ کتاب Epistemlogical Bias in the Social and Physical Sciences (سماجی اور طبعی علوم میں علمیاتی تعصّب) شائع کی جس میں سے زیر نظر مقالہ اخذ کیا گیا ہے۔ اسے اردو میں ہمارے رفیق کار اور مشہور اہل قلم ڈاکٹر اوصاف احمد نے منتقل کیا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ خوب منتقل کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ترجمہ کی شان یہ ہے کہ وہ اصل سے مل جائے۔ ہمارے دوست تو اصل سے بھی آگے بڑھ گئے۔

اس سے قبل یہ مضامین انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز سے شائع ہونے والے علمی رسالہ سہ ماہی مطالعات میں بالاقساط شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔ اور اب قارئین کے اصرار پر کتابی شکل میں شائع کیے جارہے ہیں مجھے امید ہے کہ اس شکل میں بھی ان کی پذیرائی کی جائے گی جس کی یہ کتاب بجاطور پر مستحق ہے۔

ڈاکٹر محمد منظور عالم
چیئرمین، آئی او ایس

Marfat.com

1

تمہید

- انسانوں کی زندگی، اشارات، اعمال، برتاؤ اوران لاتعداد حرکات سے عبارت ہے جن کو روزمرہ کی زندگی میں معمول کے مطابق سمجھا جاتا ہے۔ خالص عضویاتی حرکات سے قطع نظر (جیسے سانس لینا) تقریباً ہر عمل کی اپنی اہمیت ہوتی ہے اور وہ کسی نہ کسی اعتبار سے کسی شعوری یا لاشعوری انتخاب کا نتیجہ ہوتا ہے جن کے ذریعہ بعض متبادلات کو یا تو قبول کیا جاتا ہے یا پھر رد کردیا جاتا ہے۔ بعض مثالوں کے ذریعہ یہ نکتہ واضح ہوسکے گا۔
- بعض ثقافتوں میں صرف دو یا تین رنگوں کے درمیان ہی امتیاز کیا جاتا ہے چنانچہ وہاں کے دیسی باشندے صرف ان رنگوں کی ہی پہچان سکتے ہیں۔ بعض دوسری ثقافتیں ''خود'' (Self) کے تصور سے ہی نا آشنا ہیں۔ چنانچہ اگر ان ثقافتوں سے تعلق رکھنے والوں میں سے کسی فرد سے اس کی زندگی کے بارے میں سوال کیا جائے تو وہ اپنے باپ دادا کی کہانی سنانے لگتے ہیں۔ ثقافتوں میں (مادی اور روحانی) علتوں کی مختلف سطحوں کے درمیان بھی فرق ہوتا ہے۔ ''ذرا برف تو دیکھو'' جیسے سادہ جملے بھی ادا کرنے کے لئے شمالی امریکا کے اسکیمو بچے ''برف'' میں اس سے کہیں زیادہ معانی کا احساس وادراک کرسکتے ہیں جتنا کہ کسی دوسری ثقافت سے تعلق رکھنے والے اور دوسری زبان بولنے والے ''ماہرین'' کرسکتے ہیں۔
- ایک اسکیمو قبیلے کو برفانی طوفان کا سامنا کرنا پڑا جس کے دوران ایک خاندان تتر بتر ہوگیا۔ ایک عورت تو ایک سال کے لئے غائب ہوگئی اور بالآخر جب وہ ملی تو اس وقت وہ اپنے لئے ایک

Marfat.com

لباس پر کشیدہ کاری کر رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک ''سیدھی سادی'' غیر مہذب عورت بھی وہی طور پر اس حقیقت کا ادراک کر سکتی ہے کہ جمالیاتی عنصر بھی حیاتِ انسانی کی بقاو فلاح کے لئے ضروری ہے ورنہ بھلا وہ ایسی بے معنی حرکت کیوں کرتی کہ ایک ایسے وقت جب اس کو اپنی زندگی بنائے رکھنے کے لئے حرارت کی زیادہ ضرورت تھی، کشیدہ کاری لے کر بیٹھ جاتی۔ ایک عملی افادیت پسند شخص اس عورت کے اس عمل کو فعلِ عبث ہی قرار دے گا۔

- ہمارا ایک دوست کئی سال سے ایک افریقی ملک میں مقیم تھا۔ ایک دن اس کے پاس اس کے چار افریقی دوست آئے اور کچھ بات کرنے کے بجائے خاموشی سے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ہمارے دوست کو فکر ستانے لگی کہ معاملہ کیا ہے۔ دریافت کرنے پر انھوں نے کہا ''کچھ بھی نہیں۔ ہم تو بس آپ کے پاس بیٹھنے آئے ہیں''۔ ایسا لگتا ہے کہ اس ملک میں خاموشی کو الفاظ سے زیادہ بلیغ مانا جاتا ہے۔ ہمارے دوست کا کہنا ہے کہ اس دن اسے خاموشی کی قدر معلوم ہوئی۔
- ایک بار میں چند سیاحوں کے ساتھ فلسطینی شہر رفاہ میں لوہے کی اس باڑھ کے پاس کھڑا ہوا تھا جو اس شہر کو مصری اور فلسطینی حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ شہر کے مقبوضہ حصے میں کرفیو نافذ تھا جس نے اسے تقریباً ویران کر رکھا تھا۔ زندگی کی واحد علامت اسرائیل کی تین مسلح کاریں تھیں جو ایک ساتھ دھیرے دھیرے حرکت کر رہی تھیں۔ ایک چوتھی، بڑی قیمتی اور پر تعیش کار بھی کبھی کبھی ان کے پاس سے زناٹے سے گذر جاتی۔ ہمارے ساتھ قاہرہ کا ایک مشہور صحافی بھی تھا جو یہ منظر دیکھ کر بول اٹھا، ذرا اسرائیل کی مسلح کاروں کو دیکھئے۔ کیا ڈسپلن ہے۔ تینوں کاریں کس قدر ہم آہنگی اور تال میل کے ساتھ چل رہی ہیں۔ پھر بھی ملٹری گورنر کی کار ان پہ نظر رکھے ہوئے ہے۔ واقعی اسرائیل کی کارکردگی قابل تعریف ہے! مصر کا ایک سپاہی بھی وہیں موجود تھا جو سرحدوں کی چوکیداری پر مامور تھا۔ وہ یہ بات سن کر بے تحاشا ہنسنے لگا۔ اس نے کہا ''اسرائیلی مسلح کاریں خوف کی وجہ سے ساتھ ساتھ چل رہی ہیں، کرفیو کے باوجود ان لوگوں کی فلسطینیوں کے سامنے جان

Marfat.com

نکلتی ہے۔اس لئے ان میں اکیلے چلنے کی ہمت نہیں اور ملٹری گورنر تو ان سے بھی زیادہ ڈرپوک ہے۔اسی لئے وہ زناٹے سے گذر جاتا ہے"۔

اس کے بعد مصری سپاہی رفاہ کے عام لوگوں کی بہادری کے قصے بیان کرنے لگا کہ وہ کس طرح قابض فوجوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور کس طرح ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ جب کرفیو کے زمانے میں کسی گھر میں آٹا ختم ہوجاتا ہے تو وہ کاغذ کی ایک گولی بنا کر اپنے پڑوسی کے گھر پھینک دیتے ہیں وہ پڑوسی اس کاغذ کی گولی کو دوسرے پڑوسی کے گھر پھینک دیتا ہے۔اس طرح کاغذ کی یہ گولی،ایک پڑوسی کے گھر سے دوسرے پڑوسی کے گھر ہوتی ہوئی بالآخر کسی ایسے گھر میں پہنچ جاتی ہے جن کے پاس، ان کی ضرورت سے زیادہ آٹا ہے۔ پھر آٹے کی بوری اسی طرح گھروں سے سفر کرتی ہوئی ضرورتمند گھر تک پہنچ جاتی ہے۔ ہم جس دروازے کے قریب کھڑے ہوئے تھے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس مصری سپاہی نے کہا "یہ بابِ صلاح الدین" ہے،سینکڑوں سال پہلے بیت المقدس کو آزاد کرانے کے لئے صلاح الدین ایوبی اسی دروازے سے گذرا تھا۔ اندرونی شکست (جو ہر چیز کو شکست کی علامت میں تبدیل کردیتی ہے) اور اندرونی فتح میں جو ہر چیز کو سربلندی اور فتح کی علامت بنادیتی ہے، کتنا کم فرق ہے۔

جس زمانے میں، میں ملک سعود یونیورسٹی (ریاض،سعودی عرب) میں شعبہ انگریزی سے وابستہ تھا،شعبہ کے ایک استاد نے پروفیسر کے عہدے پر ترقی پانے کے لئے اپنی تصنیفات پیش کیں۔ ان کے بیشتر تحقیقی مقالوں کا موضوع تھا "غالب صیہونی رجحانات والے یہودی امریکی ناولوں میں عربوں کا تصور"۔اپنی غیر جانب داری جتانے کے لئے یونیورسٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ مقالے نہ صرف عرب بلکہ غیر عرب عالموں کو بھی رائے کے لئے بھجوائے جائیں۔ ایک امریکی پروفیسر نے لکھ بھیجا "صیہونیت تو محض ایک اختراع شدہ لفظ ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے مقالوں پر رائے دینے سے معذوری ظاہر کی۔اپنے انداز میں وہ پروفیسر یہ کہہ رہا تھا کہ صیہونیت کا تو کوئی وجود ہی نہیں ۔اگر اتفاضہ میں حصہ

Marfat.com

لینے والے بچے (جو انتفاضہ کے دوران اپنی آنکھوں، اپنے اعضاء اور اپنے گھر والوں سے محروم ہو گئے) اسے نا قابل قبول نہ پاتے، تو بے شک اس پروفیسر کا نکتہ قابل غور ہوتا۔ لیکن ان کے زخم تو محض لفظی اختراع نہیں۔

جب میں نے امریکا میں رجرس یونیورسٹی (Rutgers University) سے اپنی پی ایچ ڈی ڈگری حاصل کی تو میرے تعلیمی مشیر اور رہنما ڈیوڈ ڈائیمر میرے تحقیقی مقالے کے سلسلے خاصے پر جوش تھے۔ میرے تحقیقی مقالے کا موضوع اس وقت خاصا نیا تصور کیا جاتا تھا یعنی تاریخ اور انسانیت کا اختتام۔ میں نے اپنے تحقیقی مقالے میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ ''تاریخ کی موت'' (میں نے اس عمل کے لئے اس وقت یہی طرزِ اظہار اختیار کیا تھا) مغربی اقوام کے عام طرز فکر میں ہی مضمر ہے۔ اس کے بعد میں نے برطانوی شاعر ولیم ورڈس ورتھ اور اس کے تاریخی تخیل کا موازنہ امریکی شاعر والٹ وہٹ مین اور اس کے غیر تاریخی تخیل سے کیا۔ اس مقالے میں، میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ گو کہ وہٹ مین کو امریکا میں ''امریکی جمہوریت کا شاعر'' کہا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ آمریت اور فاشزم کا شاعر ہے۔ وہ تاریخ اور انسانیت کی موت کا وکیل ہے۔

میرے سپر وائزر نے اپنی سفارشات کے ساتھ میرا مقالہ مختلف پبلشروں کو بھجوایا۔ ان سب نے اسے شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ بسا اوقات ان کی وجوہات بڑی مضحکہ خیز ہوتیں اور بیشتر نے تو کوئی وجہ ہی نہیں بتائی۔ ایک خاص یونیورسٹی پریس کے نمائندے نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اعلا پائے کی علمی تحقیق ہے اور اپنے میدان میں ایک نمایاں علمی کارنامہ۔ کیونکہ اس میں انگلینڈ اور امریکا کی رومانوی تنقید کا موازنہ کیا گیا ہے لیکن ہمارا ادارہ اس کو شائع نہیں کر سکتا کیونکہ مقالے کے مصنف نے امریکا کی ایک محترم شخصیت (والٹ وہٹ مین) کی تنقید کی ہے جو ''قطعی'' طور پر نا قابل قبول ہے۔

Marfat.com

ایک بار ایک عرب روزنامہ نے صفحہ اول پر ایک خبر شائع کی جس کی رو سے ہندوستان میں ہونے والے ایک حادثہ میں ایک ٹرین اور ایک کار میں ٹکر کے نتیجہ میں پچاس سے زائد اشخاص ہلاک ہو گئے تھے اور 100 سے زائد اشخاص زخمی ہو گئے، اسی دن اسی اخبار کے اندرونی صفحات پر کچھ اعداد وشمار شائع ہوئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ انگلینڈ میں پیدا ہونے والے ایک تہائی بچے غیر شادی شدہ والدین کے یہاں پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ ایک کار حادثہ کی خبر اس خبر سے زیادہ اہم کیسے ہوگئی کہ برطانیہ میں پیدا ہونے والے بچوں کی کل تعداد کی ایک تہائی اس حق سے محروم ہوتی ہے کہ وہ بھی ذمہ دار والدین کی اولاد بنے، آخر کسی بنیاد پر پہلی خبر کو تو اس قابل سمجھا گیا کہ وہ صفحہ اول پر شائع کی جائے اور دوسری خبر کو اندرونی صفحات کے کسی کونے میں پھینک دیا گیا جہاں فلمی ستاروں کے شادی بیاہ اور دوسرے اسکینڈلوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں؟

جب سفید فام نو آباد کاروں نے افریقہ پر لشکر کشی کی اور وہاں کی عورتوں کو برہنہ پایا تو انھوں نے اس برہنگی کو عدم تہذیب کی ایک علامت اور غیر ترقی یافتہ طرز زندگی کا نمونہ قرار دیا۔ ملحوظ رہے کہ اس وقت مغرب کی عورتیں شام کو منعقد ہونے والے استقبالیوں اور عشائیہ کی دعوتوں میں سر سے لیکر پاؤں تک کپڑوں اور گہنوں سے لدی ہوتی تھیں۔ اسی مغرب کے لوگ اب ننگے لوگوں کے کلبوں کو کشادہ ذہنی، وسیع القلبی، اور ترقی کی علامت بتاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پچاس سال سے بھی کم کے عرصے میں برہنگی کے بارے میں مغرب کا رویہ اچانک ایک انتہا سے دوسرے انتہا تک جا پہنچا ہے کہاں تو اسے برہنگی کے خلاف تعصب تھا اور کہاں اب وہی تعصب برہنگی کی موافقت میں برتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی عورتیں اب لباس کو بدن ڈھکنے کے بجائے اپنے عریاں بدن کی نمائش کے لئے استعمال کرتی ہیں اور اگر کوئی صرف جمالیاتی نقطۂ نظر سے بھی اس پر اعتراض کرے تو اسے دقیانوسی اور تنگ نظر قرار دیا جاتا ہے۔

Marfat.com

2

تعصّب کی تعریف [Definition of Bias]

ہر انسانی برتاؤ ثقافتی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور کسی نہ کسی علمیاتی نظام فکر (Epistemological Paradigm) اور تناظر (Perspective) کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہر نظریہ (Paradigm) ایک مجرد ذہنی تصویر، (Abstract Mental Picture) ایک فرضی تشکیل، (An Imaginary Construct) اور حقیقت کا ایک علامتی اظہار ہے جو ساختیاتی تشکیلِ نو (Structural Reconstruction) کے عمل سے گذرنے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ ذہن حقیقت کے مختلف پہلوؤں کا ادراک اس طرح کرتا ہے کہ بعض پہلوؤں کو رد کرتا ہے، بعض کو قبول کرتا ہے اور بعض کو ان کی اہمیت کے اعتبار سے اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ حقیقت کی از سرِ نو ترجمانی ہو سکے۔ نظریہ کی حقیقت کے مطابق یہ عمل، حقیقت کے بعض پہلوؤں کو جن کو زیادہ اہم سمجھا جا رہا ہے، اجاگر کر سکتا ہے اور بعض دوسرے کم اہم پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ مثلاً معاشیات کا مادی نظریہ تمام غیر مادی اور غیر معاشی عوامل کو نظر انداز کر دیتا ہے جبکہ معاشیات کا انسانی نظریہ (Humanist Paradigm) ان دوسرے عناصر و عوامل کو بھی تجزیہ میں شامل کرے گا۔

ہر نظریہ کا ایک علمیاتی پہلو ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر نظریہ کے پس پشت - دخول، خروج، ساخت اور مبالغہ کا ایک عمل ہوتا ہے جو فطری معیاروں، خیالات، مفروضوں اور ان جوابات کا حامل ہوتا ہے جن سے سوالات کی وضاحت ہوتی ہے۔

ڈکشنری میں لفظ تعصب (Bias) کے معنی کسی خاص نقطۂ نظر کی وکالت کرنا بتایا گیا ہے۔

Marfat.com

قرآن پاک میں 'مُتَحَیِّزاً' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔(سورۂ انفال: آیت 16)* قدیم معاجم میں اس لفظ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور جدید معاجم میں اس لفظ کے معنی میں اختلاف ہے تاہم، عربی کی ایک معتبر لغت 'المعجم الوسیط' میں یہ معنی بتائے گئے ہیں ''ایک فریق کے خلاف دوسرے فریق میں شامل ہونا''، اس معنی میں یہ بھی شامل ہے کہ ایک گروہ کے نقطۂ نظر کو قبول کر لیا جائے اور دوسرے کو رد کر دیا جائے۔ اس مقالے میں تعصب (Bias) کی اسی تعریف کو سامنے رکھ کر آگے بات کی گئی ہے۔ تاہم تعصب کے تصور کی مزید وضاحت کے لئے اس کی چند خصوصیات کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے۔

تعصب ناگزیر ہے (Bias is Inevitable)

اول: تعصب انسانی ذہن کی ایک اہم خاصیت ہے ہمارا ذہن واقعات کا جوں کا توں، پوری صحت کے ساتھ ادراک نہیں کرتا جیسے کہ ایک مشین کرے گی۔ اس ضمن میں انسانی ذہن کا کردار مفعولی ہونے کے بجائے فعّال اور ہم انتخابی عمل کا حامل ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو کسی خاص انداز میں ہی وقوع پذیر ہوتا ہے اور جس کے پہلوؤں کا صرف جزوی ادراک ہی ممکن ہے۔

دوم: تعصب، عام طور پر زبان سے متعلق ہے اور اس کے مخصوص کردار سے متاثر ہوتا ہے، کسی بھی انسانی زبان میں ان تمام لفظیات کا وجود نہیں جو حقیقت اور اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر سکے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انتخابی عمل (Process of Selection) ناگزیر ہے، یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ہر زبان خود اپنی حقیقت کا مؤثر اظہار کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ لیکن وقت

* اضافہ مترجم: ''گزشتہ آیت میں پیٹھ پھیرنے سے منع کیا گیا ہے (انفال: 15) دو صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں: ایک 'تحرّف' کی اور دوسری 'تحیّز' کی تحرّف کے معنی ہیں ایک طرف پھر جانا یعنی لڑائی میں جنگی چال کے طور پر یا دشمن کو دھوکے میں ڈالنے کی غرض سے لڑتا لڑتا ایک طرف پھر جائے، دشمن یہ سمجھے کہ شاید یہ شکست خوردہ ہو کر بھاگ رہا ہے لیکن پھر وہ پینترا بدل کر اچانک دشمن پر حملہ کر دے۔ یہ پیٹھ پھیرنا نہیں ہے بلکہ یہ جنگی چال ہے جو بعض دفعہ ضروری اور مفید ہوتی ہے۔ تحیز کے معنی ملنے اور پناہ لینے کے ہیں کوئی مجاہد لڑتا تنہا رہ جائے تو یہ لطائف الحیل ہے یعنی میدان جنگ سے ایک طرف ہو جائے تا کہ وہ اپنی جماعت کی طرف پناہ حاصل کرے اور اس کی مدد سے دوبارہ حملہ کرے، یہ دونوں صورتیں جائز ہیں''۔ تفسیر احسن البیان (اردو) ریاض سعودی عرب: دارالسلام، ص 449۔

Marfat.com

کا اظہار کرنے کے طریقے ہر زبان میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ مزید برآں، استعارات کسی زبان کی ساخت کا اہم، اور ناگزیر، عنصر ہوتے ہیں (مثلاً سوئی کی آنکھ، کرسی کے پاؤں، پہاڑ کی جڑ، وغیرہ) اکثر جن علامتوں کے ذریعہ کسی شے کو بیان کیا جا رہا ہے (Signifier) اور جن چیزوں کو بیان کیا جا رہا ہے (Signified) وہ آپس میں خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ اشیاء میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور علامتیں اس تبدیلی کا اسی تیزی سے ساتھ نہیں دے سکتیں۔

اس سب باتوں کی اہمیت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ انسانی زبان ایک غیر متعصب آلہ (Unbiased Tool) نہیں ہے جیسے کہ الجبرا، اقلیدس (جیومیٹری) اور ریاضی کی زبان ہوتی ہے جو واقعات اور اشیاء کے غیر جذباتی اور مکمل اظہار پر تو قادر ہے لیکن سادہ سے سادہ انسانی جذبات کے اظہار پر قادر نہیں۔

سوم: اس کا مطلب یہ ہوا کہ تعصب (Bias) انسانی ادراک کا ایک بنیادی عنصر ہے جس کا تعلق مردوں اور عورتوں کی ''انسانیت'' سے ہے، یعنی انسانوں کے اساسی وجود سے جس کو فطرت کے عام قوانین کے تابع نہیں کیا جا سکتا۔ انسان جو کچھ بھی ہے، اپنے اندر انفرادیت اور یکتائی (Uniqueness) کا حامل ہے، بس یہیں سے تعصب کا عنصر بھی داخل ہو جاتا ہے۔ اگر ثقافت (Culture) کا تعلق ''ان تمام چیزوں سے ہے جن کی تخلیق انسان نے کی ہے برعکس ان چیزوں کے جن کی تخلیق فطرت نے کی ہے'' تو ثقافتی پہلو بالضرور تعصب کا حامل ہے۔ بسا اوقات تو تعصب فطری اشیاء میں بھی شامل ہو جاتا ہے کیونکہ بالآخر یہ انسان ہی ہے جس نے ان فطری اشیاء کو دریافت کیا، خواہ ایسا اتفاقاً ہی کیوں نہ ہوا ہو۔ جب انسان کسی فطری شے کو دریافت کرتے ہیں (جیسے پہاڑ، دریا، وادیاں وغیرہ) تو اس کو کوئی نہ کوئی نام دے دیتے ہیں اور اس طرح اس شے کو انسانی علم کے خزانے میں داخل فطری دنیا سے ''انسانی دنیا'' میں لے آتے ہیں۔

Marfat.com

تعصب ناگزیر تو ہے لیکن حتمی نہیں

[Bias is Inevitable but not Ultimate]

کوئی ضروری نہیں کہ تعصب کی ناگزیریت (اور یہ حقیقت کہ وہ انسانی اور ثقافتی وجود سے متعلق ہے) رنج اور مایوسی کا سبب بھی بنے۔ اس کے منفی پہلوؤں سے قطع نظر، تعصب کوئی بری چیز نہیں۔ تعصب سے متعلق مسائل کا ایک دوسرے تناظر سے جائزہ لینا ممکن ہے۔ اس طرح اس کے بجائے کہ میں اپنے تعصب کو کسی دوسرے کے تعصب کے مقابل رکھوں، یہ ممکن ہے کہ میں تعصب کی ازسرنو تعریف کروں اور اس کو انسان کی انفرادیت و یکتائی اور انتخاب کی آزادی (Freedom of Choice) کا ایک مظہر قرار دوں، اس میں کچھ تناقض ضرور پایا جاتا ہے لیکن یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ انسانی زندگی تو ایسی ہی ہے۔ یہ تناقض ہی ایک ایسا بنیادی نظام بھی فراہم کرتا ہے جس کو میں عہد روشن خیالی کی عطا کردہ اصطلاح ''ایک انسانیت'' کے برخلاف ''مشترکہ انسانیت'' کہتا ہوں۔

مشترک انسانیت ایسا انسانی امکان ہے جو ہماری فطرت وجبلّت کا حصہ ہے۔ تاہم جب اس امکان کا حصول اور ادراک کرلیا جاتا ہے تو یہ اپنی شکل اور ماہیت کے اعتبار سے مختلف افراد، مختلف اقوام، مختلف زمانوں اور مختلف تہذیبوں میں الگ الگ ہوتا ہے۔ چنانچہ امکانی وحدت اور ناگزیر تفریق دونوں سے ہی مشترکہ انسانیت کی نفی نہیں ہوتی۔ انسانوں کی تخلیق ایک خدا نے کی اور اس نے تمام انسانوں کو ایک مشترک فطرت پر پیدا کیا۔ لیکن خالق کی یہ مرضی بھی ہوئی کہ یہ تمام انسان ایک جیسے نہ ہوں، ایک ہی قوم سے تعلق نہ رکھیں بلکہ مختلف قوموں اور قبائل کی تشکیل کریں اور ان میں سے ہر ایک مختلف انتخابات (Choice) کی حامل ہو۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ایک دوسرے سے متعارض اور متصادم بھی ہوں اور نہ ہی اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ ایک دوسرے کی نفی کریں۔ کچھ بھی کہا جائے لیکن یہ حقیقت تو اپنی جگہ رہتی ہے کہ افہام وتفہیم اور ترسیل کا امکان ہمیشہ رہتا ہے:

Marfat.com

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (سورہ شوریٰ:8)

(ترجمہ) اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔

پھر بھی اس کی مرضی یہی ہوئی کہ ہم سب ایک دوسرے سے مختلف ہوں تا کہ ہمارے درمیان مسابقت اور ابلاغ ممکن ہو سکے۔ اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود انسانی زبانیں کامیاب ابلاغ پر قادر نہیں تا کہ صداقت کا اظہار ہو سکے، تعصب پر قابو پایا جا سکے اور ایسے علمیاتی نظریئے اور نظام وضع کیے جا سکیں جو گو کہ کسی خاص ثقافتی تجربہ سے جنم لیتے ہیں لیکن تمام متعلق فریقوں کی جانب کامیاب اور منصفانہ ابلاغ پر قادر ہوتے ہیں۔

خود اور دوسرے

پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ ایک عرب تھے لیکن پوری نسلِ انسانی کی طرف مبعوث کیے گئے تھے:

(ترجمہ) نہ کسی گورے کو کالے پر فضیلت ہے اور نہ کسی کالے (غیر عرب) کو گورے (عرب) پر۔ سوائے تقویٰ کے۔

یہ ایک ناقابل ترمیم و تنسیخ اخلاقی صداقت ہے۔ ایک غیر عرب کی شناخت ایک عرب سے متعلق ہوتی ہے چنانچہ ان کے تعصبات بھی مختلف ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ان کے درمیان مشترک حوالہ کا ایک آخری نقطہ موجود رہتا ہے۔ تقویٰ۔ اسی بنیاد پر ہم نے یہ قیاس ظاہر کیا ہے کہ تعصب ناگزیر تو ہو سکتا ہے لیکن حتمی نہیں۔ یہ ان معنوں میں ناگزیر ہے کہ اس سے بچنا غیر ممکن ہے۔ لیکن یہ ان معنوں میں حتمی نہیں کہ انسانیت کی تقدیر تعصب نہیں ہے بلکہ مشترک انسانیت اور اخلاقی اقدار ہیں جو کسی بھی تفریق یا تعصب کی تشکیل سے پہلے آتی ہیں۔

Marfat.com

تعصب کی شکلیں

1- تعصب صداقت کی حمایت میں بھی ہوسکتا ہے۔ جب کوئی حق کی حمایت میں متعصب ہو جاتا ہے تو اس میں مزید جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے لئے بھی آمادہ ہو جاتا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے فیصلوں کو خارجی نظام اقدار کے سپرد کرے اور ان صداقتوں کو قبول کرنے کے لئے تیار رہے جن کا وجود (اس کے علم و یقین) کے باہر ہے۔ اس صورت حال میں وہ اپنی تحقیق کے نتائج پر کھے جانے کے لئے بھی تیار رہتا ہے کیونکہ اس کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ اس کا متعصب فیصلہ ہی حرف آخر ہے، یہ سب سے بڑا اور سب سے پہلا اجتہاد ہے۔

2- باطل کے حق میں بھی تعصب کئی شکلیں اختیار کر سکتا ہے۔ مثلاً خود اپنے بارے میں تعصب، جب لوگ اپنے آپ کو حوالے کا آخری نقطہ قرار دینے لگیں تو ماورائی حق کے تصور کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اور ان کو کسی خارجی نقطہ سے جانچنا ممکن نہیں رہتا۔ اس تعصب کا تعلق قوت سے متعلق تعصب سے بھی ہوتا ہے۔ کہ فتح کی صورت میں تو فاتح اپنی مرضی چلانا چاہتا ہے اور جب وہ شکست سے دوچار ہو تو وہ عملیت پسند (Pragmatic) بن جاتا ہے اور فاتح کی ہر بات اور ہر حکم کو صداقت کے معیار پر پرکھے بغیر سر جھکانے لگتا ہے۔ اس صورت حال میں طاقت واحد ثالث رہ جاتی ہے۔ اور شکست خوردہ عملیت پسند کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ بے صبری سے اس کا انتظار کرے کہ طاقت کا توازن اس کے حق میں ہو جائے۔ اس لئے موقع پرستانہ عملیت پسندی اور موافقت (Pragmatic Accomodation) کا نتیجہ ہم آہنگی اور امن کے بجائے مستقل تنازعوں اور تصادم میں نکلتا ہے۔

3- کچھ تعصب واضح اور شعوری ہوتے ہیں جبکہ بعض دوسرے تعصبات غیر واضح اور غیر شعوری ہوتے ہیں۔ شعوری تعصب ہر اس شخص میں پایا جاتا ہے جو ارادتاً کسی نظریہ کو چن لیتا ہے، دنیا کو اسی عینک سے دیکھتا ہے اور اس کے حق میں (رائے عامہ) کو سازگار کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کے

Marfat.com

برعکس غیر شعوری تعصب اس وقت ہوتا ہے جب کوئی کسی علمیاتی نظام کو، اس کے تمام مفروضوں، دعووں اور ترجیحات سمیت قبول کرلیتا ہے اور غیر شعوری طور پر دینا کو صرف اسی زاویہ سے دیکھتا ہے۔

واضح تعصب کا ایک اظہار سستے پروپیگنڈے میں ہوتا ہے، واقعہ تو یہ ہے کہ وہ لوگ جو اس قسم کے پروپیگنڈے کا نشانہ ہوتے ہیں اس کے دعووں کو فوراً ہی پہچان لیتے ہیں۔ اس کے برعکس غیر واضح اور مضمر تعصب کے شکار غیر شعوری طور پر اس سے متاثر ہوتے رہتے ہیں، بسا اوقات شعوری تعصب کو غیر واضح اور غیر محسوس بنا کر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اس کے وصول کنندگان کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اس کی ایک بیّن مثال وہ تجارتی اشتہارات ہیں جن میں بے انتہا متعصب مشتہرین اپنی اشیائے تجارت اور جنس کے مابین ایک تعلق قائم کر دیتے ہیں اور جس کا معصوم کچے ذہنوں پر گہرا تاثر قائم ہو جاتا ہے۔

سیاسی اور اخلاقی سطحوں پر بھی ان ہی رجحانات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ مغربی فلمیں غیر محسوس طور پر ہالی وڈ میں جنمے اقدار، جیسے تشدد، جنس اور تجسس کو فروغ دیتی ہیں۔ ان اقدار کی افزائش اس دنیاوی تصور سے ہوتی ہے جس کو ڈارون نے رائج کیا تھا۔ اگر ان کو براہِ راست پیش کیا جائے تو قابل نفریں سمجھ کر ذرا دیر کے لئے بھی قبول نہ کیا جائے۔ لیکن ویسٹرن فلموں اور ٹام جیری کارٹونوں کے ذریعہ یہی اقدار ''بے ضرر تفریح'' کی شکل میں پیش کی جاتی ہیں جیسے یہ کسی نظام اقدار اور علمیاتی نظریہ کی تجسیم ہی نہ کرتے ہوں۔

4- تعصب کی درجہ بندی اس کی شدت کے اعتبار سے بھی کی جاسکتی ہے، یہ تیز، واضح اور شدید بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ حقیقت نگاری کے مدعی سوشلسٹ ناول نگاروں کے یہاں ملتا ہے۔ ان ناولوں میں فتح ہمیشہ مزدور طبقہ کی ہوتی ہے جبکہ بورژوا طبقہ کی عکاسی ایسے کی جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ گریزپا، زوال پذیر، اور اخلاق باختہ ہو۔ بالآخران کا مقدر یہی ہے کہ وہ پرولتاری طبقہ سے تبدیل کردیئے جائیں۔ یا پھر ان میں ایسے بورژوا دانشوروں کو پیش کیا جاتا ہے جو تاریخ کے قوانین سے آشنا ہیں، ہوا کا رخ

Marfat.com

پہچانتے ہیں اور جنھوں نے اپنے طبقاتی رشتے ترک کر کے اپنی قسمت مزدور طبقہ کے ساتھ جوڑ دی ہے ان ناولوں کا اختتام ہمیشہ مزدوروں، کسانوں اور دانشوروں کے انقلابی اتحاد کی کامیابی پر ہوتا ہے۔ فی الحقیقت تعصب ہمیشہ اتنا واضح نہیں ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی خاص نظریہ کے لئے متعصب ہو، اور اس کے فروغ کے لئے کوشاں ہو لیکن اس کو نظریہ کے اطلاق کی راہ میں حائل دشواریوں کا احساس بھی ہو۔ مختلف افراد میں تعصب کی شدت مختلف ہو سکتی ہے۔ مختلف علوم میں بھی تعصب کا درجہ مختلف ہو سکتا ہے، اس کا انحصار صرف اس پر ہے کسی علم کا اس ملک وملت کی ثقافتی روایت سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ اسی لئے مذہبی اعتقادات، روایات، اور انسانی تعلقات ہیں جن کا اظہار، بیشتر ادب، فنون لطیفہ اور افکار عالیہ میں ہوتا ہے، تعصب کی شدت پائی جاتی ہے۔ ٹکنالوجی اور صنعت کے میدانوں میں بھی اوسط درجہ کا تعصب پایا جاتا ہے لیکن دوسرے ''خالص علوم'' جیسے طبیعات، ریاضیات، حیاتیات وغیرہ میں تعصب کا دخل کم سے کم ہوتا ہے۔

5- بسا اوقات تعصب کے اندر بھی تعصّب کا وجود ہوتا ہے جب کوئی محقق اپنی تحقیقات کے لئے ایک مفصل علمیاتی نقطۂ نظر کے اندر کسی خاص نظریہ سے وابستگی اختیار کر لیتا ہے تو اس کے علمی کام میں دوہرے تعصب کا دخل ہو جاتا ہے، مثلاً عرب دینا میں سماجیات کے برطانوی اور فرانسیسی نظریات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور ان کے مقابلے میں جرمن نظریات کو نظر انداز کیا جاتا ہے حالانکہ تینوں ہی عام طور پر مغربی سماجیاتی نظریات سے تعلق رکھتے ہیں۔ تو یہ تعصب عام طور پر سماجیات کے مغربی نظریات کے حق میں نہیں ہے بلکہ اس کی ایک شاخ سے ہے۔ اس لئے تعصب در تعصب ہوا۔

6- اس کے برعکس صورت حال کا وجود بھی ممکن ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب کوئی محقق، کسی خاص علمیاتی نقطۂ نظر کے فہم وادراک کے بغیر مختلف اور اکثر متناقض (Incompatible) علمیاتی نظام ہائے فکر کے متضاد خیالوں کے حق میں تعصب برتنے لگتا ہے۔ مثلاً کچھ عرب شعراء عہد روشن خیالی (Enlightenment) میں رائج بعض فکری رویوں مثلاً عقلیت پرستی، امید پرستی وغیرہ کو اپنا لیتے ہیں،

Marfat.com

لیکن جب وہ نظری بحثوں سے قطع نظر، ادبی تخلیق کرنے بیٹھتے ہیں تو یاسیت سے بھرپور جدید نظمیں لکھتے ہیں جن میں غیر عقلیت (Irrationality) اور زندگی کی بے معنویت (Absurdity) وغیرہ کا تذکرہ ہوتا ہے۔ یہی حال مغرب کے ان بعض سیکولر دانشوروں کا ہے جو اپنی روشن خیالی کے زعم میں ہندوازم، اسلام اور کنفیوشنس ازم، وغیرہ کے بعض خیالات سے متاثر ہو کر ان کا ملغوبہ بنا لیتے ہیں اور ان مذہبی نظاموں کے باہمی تناقض پر ان کی نگاہ نہیں جاتی۔

7- تعصب جزوی بھی ہوسکتا ہے اور کلی بھی۔ جزوی تعصب کی مثال اس مغربی مصنف کے افکار میں دیکھی جا سکتی ہے جو کسی خاص مشرقی مصنف یا مشرق کے فنی اظہار میں تو دلچسپی لیتا ہے لیکن اس علمیاتی نظام (Epestimological Paradigm) کو نہیں سمجھ سکتا جو اس فن پارہ میں موجود ہے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال آرتھر فٹز جیرالڈ میں دیکھی جا سکتی ہے جس نے فارسی کے مشہور و معتبر شاعر عمر خیام کی رباعیات کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، عہد وکٹوریہ کے ایک فنکار کی حیثیت سے فٹز جیرالڈ نے فارسی اسلامی تہذیب سے ان اجزاء کا انتخاب کیا جو اس کے اور اس عہد کے مزاج سے مطابقت رکھتے تھے۔ اُس کو اِس فارسی شاعر میں بڑی کشش محسوس ہوتی تھی جو اپنی ہی دنیا میں اجنبی محسوس کرتا تھا۔ اس کی دوسری مثال ان عرب شعراء میں مل سکتی ہے جو شکسپیر سے متاثر ہوئے اور جنھوں نے اس کی کئی نظموں اور ڈراموں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ ان لوگوں نے شکسپیر کے افکار میں سے صرف وہ چیزیں ترجمہ کے لئے پسند کیں جو خود ان کے مذاق سے مطابقت رکھتی تھیں۔ شکسپیر کے تصور کائنات سے ان لوگوں نے کچھ سروکار نہیں رکھا۔ ان میں سے ایک صاحب نے تو ہیملٹ کا انجام ہی تبدیل کر دیا اور اس کو طربیہ بنا ڈالا جس میں نیکی کو اس کا انعام اس طرح ملتا ہے جس طرح ایک منصف مزاج، اور غیر المناک دنیا میں ہونا چاہیے۔

جزوی تعصب ان بااعتماد اشخاص کے افکار و اعمال میں بھی نظر آتا ہے جو اپنے ہی خیالات و نظریات کی دنیا میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ مختلف طرح کے مخصوص تعصبات کے حامل ہوتے ہیں اور چند

Marfat.com

خاص چیزوں کی ہی حمایت کرتے ہیں۔ میزان خود ان کے اپنے ہاتھوں میں رہتا ہے۔ گو کہ یہ درآمد شدہ اشیاء، خیالات اور افکار سے ہرگز خوف زدہ نہیں ہوتے لیکن میزان تو ازن تو خود ان کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنے خود ساختہ معیاروں کے مطابق ہی ہر چیز کا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ دوسری ثقافتوں سے خیالات اخذ کرنے سے ہراساں نہیں ہوتے بلکہ ان سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ بسا اوقات یہ لوگ جس چیز سے خوف زدہ ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ ان کے تصورات و خیالات کا وزن، کوئی اور کرے اور یہ ایک ایسے میزان پر کیا جائے جو دوسروں نے ان کے ہاتھ میں تھما دیا ہو۔ یہ اس سے بھی ہراساں رہتے ہیں کہ ان کو اپنے بارے میں صیغہ غائب استعمال کرنا پڑے یا دوسروں کے بارے میں باب اجتہاد بند کر دیا جائے۔ یہ لوگ بظاہر ایک کھلے اور لچکیلے نظریاتی نظام میں کام کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے افکار و خیالات خود ان کی ذہنی اور ثقافتی زمین کی پیداوار ہوتے ہیں اور یہ کبھی اس کے آگے سر نہیں جھکاتے جیسے ایک مغربی مصنف نے ''درجہ بندی کی استعماریت'' (Imperialism of Category) قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف دوسروں کے افکار و خیالات مستعار لیے جائیں بلکہ ان کی تجزیاتی درجہ بندیوں اور تصور کائنات پر بھی انحصار کیا جائے اور اس طرح معاملات کی درجہ بندی کا تعین دوسروں کے دیئے گئے میزان پر کیا جائے۔

خودی سے پیدا ہونے والا اجتہاد سائنسی انداز نظر (Scientific Outlook) کی نفی نہیں کرتا۔ کیونکہ طبعی علوم کلیات (Totalities) حتمی اور آخری مقاصد (میزان) سے بحث نہیں کرتے بلکہ ان کا تعلق اجزاء اور کیفیات (جو اشیاء وزن کی جائیں) سے ہیں اسی طرح اقدار، صداقت اور مقاصد ان کے دائرۂ کار سے باہر ہیں۔ ان کا تعین، خود انسانوں کے عقائد کے مطابق کیا جاتا ہے۔ جو لوگ دوسروں کے تجزیاتی نظام کو بغیر سوچے سمجھے قبول کر لیتے ہیں یا اس کا اتباع کرنے لگتے ہیں وہ دوسروں کے انتخابات (Choices) تصور کائنات اور تجزیاتی درجہ بندیوں کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ طبعی علوم نہ تو

Marfat.com

اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں اور نہ اسے ممنوع قرار دیتے ہیں۔

8- تعصب کی ایک نئی شکل وہ ہے جسے ہم "ہماری مادّی حقیقت کا خود ہمارے خلاف تعصب" کہہ سکتے ہیں۔ اس کی کوئی مثال گذشتہ ثقافتوں میں نہیں ملتی۔ نو آبادیاتی عہد میں مغربی نو آبادکار، مسلم بستیوں میں گھس گئے۔ انھوں نے ان گھروں کو تباہ و برباد کر دیا جن سے مسلم ثقافتی شناخت کا اظہار ہوتا تھا، انھوں نے ان شہروں کو بھی تاراج کر دیا جن کے تعمیراتی کردار سے اسلامی اقدار جھلکتی تھیں۔ ان کی جگہ نئے شہر وجود میں آ گئے جن سے نو آبادکاروں کی اپنی اقدار کا اظہار ہوتا تھا جیسے رفتار، مہارت اور مسابقت، ان شہروں کو اس طرح تعمیر کیا گیا کہ نو آبادکاروں کو نو آبادی پر قابو رکھنے میں مدد مل سکے۔ سڑکیں چوڑی کی گئیں تاکہ تیز رفتار کاریں ان پر دوڑ سکیں۔ (اب یہ دوسری بات ہے کہ یہ فرض کر لیا گیا کہ تیز رفتار کاریں موجود ہیں)۔

مسلمانوں کے بڑے شہروں کی تعمیر، اس مفروضہ کی بنیاد پر کی گئی تھی کہ پیدل چلنے والوں کی تعداد موٹر نشینوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ اور سواری کا استعمال نجی افراد سے زیادہ سرکاری افراد کرتے ہیں۔ جدید شہروں کی بڑی بڑی چوڑی سڑکیں، انتظامی ضرورت کی نمائندگی کرتی ہیں کہ رعایا پر قابو رکھنے کے لئے ایک طاقتور انتظامی مرکز (یا مرکزی قومی حکومت) کو ان کی ضرورت ہے، ملحوظ رہے کہ سترہویں صدی عیسوی تک یوروپ کی چوڑی سڑکوں کو لاطینی زبان میں Via Militarez کیا جاتا تھا جس کا مطلب ہے "فوجی سڑکیں یا فوجی راستے" ان چوڑی سڑکوں کے ذریعہ سرکاری فوجی دستے آسانی سے آبادیوں تک پہنچ سکتے تھے اور باغیوں کی سرکوبی کر سکتے تھے۔ چھوٹی سڑکیں اور گلیاں صرف آبادی کے گذرنے کے کام آ سکتی ہیں۔ سواری گاڑیوں اور افواج کے لئے وہ کسی کام کی نہیں۔

مسلم ملکوں میں اب جدید گھر اس طرح کے مسالے سے تعمیر کئے جاتے ہیں کہ سورج کی روشنی زیادہ سے زیادہ جذب ہو سکے۔ گرم علاقوں میں موسم گرما میں اس سے ائرکنڈیشننگ کی ضرورت مین اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دوسری بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑنے لگی ہے جن کو اب "جدید

141552

Marfat.com

زندگی کی ضروریات'' سمجھا جاتا ہے۔ کار اس لئے ضروری ہے کہ اس سے وقت (اور کبھی کبھار زندگی کی) بچت ہوتی ہے۔ اگر ایئر کنڈیشنز نہ ہو، تو دن بھر پسینہ بہتا رہے اور بالآخر پیداواری صلاحیت بھی گھٹ سکتی ہے۔

موجودہ زمانے میں عرب دنیا کے اوقاتِ کار میں بھی مغربی ثقافت کے تعصب کی جھلک ملتی ہے جس سے فی الحقیقت یہ اخذ کیا گیا ہے۔ مسلم تہذیب کے لئے یہ کہیں زیادہ مناسب ہے کہ دن کا آغاز فجر کے فوراً بعد ہو اور ظہر تک کام ختم ہو جائے۔ لوگ اپنے سماجی کام کاج شام کے وقت نپٹا سکتے ہیں اور عشاء کے بعد سونے کا وقت شروع ہو سکتا ہے، ہم یہ تجویز کسی حتمی صداقت کی طرح نہیں پیش کر رہے ہیں۔ ہم صرف یہ عرض کر رہے ہیں اس تجویز کی عملیت کا جائزہ لیا جائے بالخصوص ان حقائق کی روشنی میں کہ اس تجویز کے روبہ عمل آنے سے نہ صرف برقی قوت کی بچت ہوگی بلکہ حیاتیاتی اور ماحولیاتی ہم آہنگی سے پیدا ہونے والا نفسیاتی سکون بھی خوش آئند ہوگا۔ اس موضوع پر تحقیق مزید کے ذریعہ یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ واقعتاً یہ تجویز قابل عمل ہے بھی یا نہیں۔ ہو سکتا ہے اس تحقیق کے متوقع نتائج سے بعض لوگوں کو اختلاف ہو لیکن ہمیں درآمد شدہ نظام کے سامنے سر جھکا دینے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں جو نہ صرف یہ کہ خود ہمارے مفاد کے خلاف ہے بلکہ ہمارے حیاتیاتی اور ماحولیاتی نظاموں سے بھی ہم آہنگ نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح ہم ''خود'' کو ''دوسروں'' کی غلامی سے آزاد کرا سکیں اور اس طرح ہماری تخلیقی قوتیں بھی بیدار ہو جائیں۔

Marfat.com

3

مغربی ثقافتی نظام کے حق میں تعصب

مغربی ثقافتی نظام کے حق میں پھیلا ہوا تعصب فی زمانہ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے تعصب کی سب سے معروف شکل ہے۔ یہاں پر اس کی کچھ مثالیں دی جاتی ہیں:

- جب 1963ء میں امریکا کی ییل یونیورسٹی (Yale University) میں موسم گرما کا ایک کورس کرنے کے لئے گیا تو مجھے شکسپیئر کا ایک ڈرامہ دیکھنے کے لئے مدعو کیا گیا۔ میں نے اس وقت ایک غیر رسمی لباس پہن رکھا تھا۔ میرے ایک امریکن پروفیسر نے مشورہ دیا کہ میں کالر اور ٹائی لگا کر جاؤں۔ ''کیا شکسپیئر اتنے احترام کا مستحق بھی نہیں؟ اس نے سوال کیا، شکسپیئر سے اپنے لگاؤ اور تعلق کی وجہ سے میں دوبارہ اپنے کمرے میں گیا اور جس طرح مجھے مشورہ دیا گیا تھا، آراستہ ہوکر واپس لوٹا، پروفیسر نے میرے ادب اور تمیز کی بڑی تعریف کی۔ لیکن 1969ء میں مصر لوٹنے سے قبل مجھے ایک بار پھر بعض دوستوں کے ساتھ یہی ڈرامہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ پچھلے تجربہ کی روشنی میں، اس بات میں نے پہلے سے ہی کالر اور ٹائی ڈاٹ رکھی تھیں۔ میرے دوستوں نے میرا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ چند برسوں کے عرصے میں ہی رسمی لباس نہ صرف یہ کہ فیشن سے باہر ہو چکا تھا بلکہ اعلیٰ طبقہ کی ایک علامت بھی بن چکا تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ لباس صرف یہ کام نہیں کرتا کہ ہماری تن پوشی کرے۔ یہ ایک علامت بھی ہے۔ بلکہ ایک مکمل علامتی زبان ہے۔ اس وقت سے ہی میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں خود اپنی زبان بولوں گا طوطے کی طرح کسی اور کی زبان نہیں دہراؤں گا۔ اس وقت سے ہی میں نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ میں بنے بنائے فیشن کا اتباع نہیں کروں گا۔ بلکہ اپنے ذہن وخیال کے مطابق اپنے فیصلے خود کروں گا۔

Marfat.com

- اپنی طفولیت کے زمانے میں ہی مجھے احساس ہوگیا تھا کہ ا

گھرانے میں خاتون خانہ کے لئے فکر وتشویش کا ایک بڑا سبب اس کا چائے کا چینی۔ ہے۔ س میں ایک ہی طرز اور رنگ کی ایک درجن طشتریاں اور پیالیاں ہوتی ہیں۔ اگر کسی ملازم یا مہمان سے خدانخواستہ کوئی پیالی یا طشتری ٹوٹ جائے تو قیامت کا سماں ہوتا کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس سیٹ کا تناسب وتوازن بگڑ جائے۔ کسی نامعلوم سبب کی بناء پر یہ تناسب ہمارے ذہنوں میں لڑکپن سے ہی راسخ ہو چکا تھا۔

انھیں اسباب کی بناء پر ہماری رائے ہے کہ ہم تناسب وتوازن کے اس خاص انداز سے دوسروں کو مرعوب کرنے کی عادت سے دامن چھڑالیں اور اس کو غیر متناسب، نامکمل طرز سے تبدیل کردیں جو انسانی زندگی کے لئے زیادہ مناسب ہو۔ تکمیل تو صرف ذات باری تعالیٰ کو ہی زیب دیتی ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ چائے کا سیٹ 6 یا 12 یا 24 کیوں ہو۔ 7 یا 8 یا 9 کیوں نہیں؟ تمام اجزاء ایک جیسے کیوں ہوں؟ کیا ہر طشتری یا پیالی اپنی جگہ یکتا (Unique) نہیں ہوسکتی؟ کم سے کم اس سے یہ فائدہ تو ہوگا کہ کسی ایک پیالی کے ٹوٹ جانے سے اس کے اقلیدسی تناسب کے بگڑ جانے اور سیٹ کے خراب ہو جانے کا اندیشہ تو نہ ہوگا۔ ایک ہی سیٹ میں مختلف طرح کے پیالوں اور طشتریوں کے ہونے سے کثرت، بوقلمونی اور رنگارنگی کا احساس بھی ہوگا۔ بالآخر ہم کثرت اور رنگارنگی کے عہد میں جی رہے ہیں، اس نظام سے یہ آسانی بھی ہوگی کہ ہمارا کوئی دوست صرف ایک پیالی اور طشتری پر مبنی سیٹ تحفے میں پیش کر سکے گا۔ ہر سیٹ کا اپنی جگہ ایک الگ اور یکتا تشخص ہوگا، میں جانتا ہوں کہ متوسط طبقے میں میری یہ تجویز مقبولیت کا کوئی امکان نہیں رکھتی۔ پھر میں کون ہوتا ہوں کہ ان کے ذوق میں تبدیلی کا مطالبہ کروں اور اتنے راسخ خیالات کو چیلنج کروں۔

اچھا کیا ہو اگر پیرس کا کوئی فیشن ڈیزائنر ''فطرت کی طرف'' واپسی کا ارادہ کرے اور یہ

Marfat.com

اعلان کرے کہ مور پنکھ کے رنگ اب فیشن میں شامل ہوں گے۔ کیا لوگ اس کے اس مشورے کی پیروی نہیں کریں گے یا اگر وہی ڈیزائنر اس طرح کے لباس وضع کرے جن میں فطرت کی طرف واپسی کا مطلب یہ ہو کہ عورتوں کے اسکرٹ میں ''دُم'' ہو یا دُم نما اضافہ ہوتا کہ انسان کو اس کا حیوانی پس منظر یاد دلائے تو کیا کوئی اس فیشن ڈیزائنر سے اختلاف کرنے کی ہمت کرے گا؟ شاید نہیں! اب اگر ان فیشن ڈیزائنروں کے احمقانہ خیالات قابل قبول ہوسکتے ہیں تو پھر میری تجاویز میں کیا برائی ہے؟

● کسی اوسط درجہ کے عرب گھر میں جائیے تو آپ کو پہلی نظر میں ہی بیڈروم کے علاوہ ڈائننگ روم اور ڈرائنگ روم نظر آئیں گے جو رنگین اور سنہرے میز پوشوں سے مزین ہوں گے۔ ہوسکتا ہے ایسے صوفے بھی مل جائیں جن کی سیٹوں پر سونا چڑھا ہو۔ اس کے برعکس اگر آپ کسی روایتی جاپانی گھرانے میں جائیں تو صرف دو یا تین کمرے ملیں گے جن کی سجاوٹ بڑی سادگی سے کی گئی ہوگی۔ ایک کمرہ ڈائننگ روم کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک کمرہ دن میں تو ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا ہو اور رات میں اسے بیڈروم میں تبدیل کیا جاتا ہو۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ عربوں کے متوسط طبقے نے اپنے روایتی عرب گھروں کو خیرباد کہہ دیا ہے جن میں اندرونی برآمدے، اونچی کھڑکیاں، بیٹھکیں اور طرح طرح کے فرنیچر ہوا کرتے تھے۔ ان کے بجائے مغربی یوروپ کے 19ویں صدی کے تصورات کو اپنا لیا گیا ہے۔ اس کا آغاز اس وقت ہوا جب مغرب زدہ عرب اشرافیہ طبقہ (امراء، جاگیردار اور درباری لوگ) نے اس ذہن میں کہ ان کے ملک بھی ''یوروپ'' جیسے نظر آئیں مغرب کی نقالی شروع کی، اس دھن میں انھوں نے اپنا تہذیبی ورثہ ترک کردیا اور ہر مغربی چیز کے جنون میں مبتلا ہوگئے۔ مغربی ڈیزائن سازوں سے کہا گیا کہ وہ ان لوگوں کے لئے ایسے ماحول کی تخلیق کریں جو دیکھنے میں بالکل یوروپ لگتا ہو تا کہ طبقہ اشرافیہ کے مغربی خواب پورے ہوسکیں۔ متوسط طبقہ کے کچھ لوگوں نے بھی ان کی نقالی شروع کردی گو کہ نہ تو یہ لوگ ان باتوں کو سمجھنے کے لئے علم رکھتے تھے اور نہ ہی ان کے مالی وسائل انھیں اس نقالی کی عیاشی کی اجازت دیتے تھے۔ چنانچہ متوسط طبقے کے

Marfat.com

لوگوں نے ان ڈیزائنوں اور طور طریقوں میں ایسی تبدیلیاں کرنا شروع
چھوٹی جگہوں پر سما سکیں۔ نتیجتاً فرنیچر کا ایسا ڈیزائن عام ہو گیا جس کو
کہا جاتا تھا۔[یعنی جو لوئی XV یا لوئی XVI کی طرح اصل فرنچ تو نہیں لیکن اس کی ایک
ضرور ہے!]

.اس کا مطلب یہ ہوا کہ مصری گھرانوں کا فرنیچر کسی مقامی بازار سے نہیں آتا بلکہ ایک بے حد پیچیدہ تاریخی عمل کے ذریعہ مغرب سے درآمد کیا گیا ہے۔ فرنیچر محض اشیاء نہیں ہیں جن کو گھر میں سجاوٹ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ بلکہ یہ عرب اشرافیہ کے شعوری ثقافتی انتخاب کی تجسیم ہے جس نے فن تعمیر اور فرنیچر میں مغربی نظریات کو اپنا لیا ہے۔ متوسط طبقہ کے لئے یہ ایک غیر شعوری ثقافتی مفاہمت ہے۔

اس موضوع کا ایک اور دلچسپ پہلو اس امر کی تفتیش ہے کہ غیر شعوری تعصب کس طرح ایک فرد کی زندگی میں روزمرہ کی حقیقت کو تبدیل کر سکتا ہے۔ مصری متوسط طبقے کے ایک گھرانے کے حصے میں رہائش کے لئے بہت کم علاقہ ہوتا ہے جس میں مغربی طرز کے فرنیچر کے لئے زیادہ گنجائش نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس قسم کا فرنیچر اس گھرانے کے لئے عذاب بن جاتا ہے ایک تو اس کی قیمت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ دوم اس کے لئے اس سے کہیں زیادہ گنجائش کی ضرورت ہوتی ہے جتنی کہ موجود ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس فرنیچر کو کسی کمرے میں ٹھونس ٹھانس کر بھر دیا جاتا ہے، اور گھر والے اس سے پیدا ہونے والے گلیاروں میں مشکل سے ہی چل پھر سکتے ہیں۔ دریں اثنا گھر والی کو سونے کے پانی والے سنہرے صوفوں پر بچوں کے حملوں کا مقابلہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ گھر والے تو یہی چاہتے ہیں کہ اس فرنیچر کو کسی کمرے میں بھر دیا جائے اور اس کو صرف کسی بہت ہی اہم مہمان کی آمد کے وقت کھولا جائے۔ بظاہر سال میں ایسے مواقع ایک دو بار سے زیادہ نہیں آئیں گے۔ اس لئے ''فرنیچر روم'' گھر والوں کے لئے بالکل بے کار ثابت ہوتا ہے بلکہ اس سے ان کی زندگی تباہ ہو کر رہ جاتی ہے، اس سے اچھی قسمت تو

Marfat.com

ڈائننگ روم کی ہوتی ہے اس لئے کہ بیشتر اس کو ایک اسٹڈی (کمرۂ مطالعہ) میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ کھانے کی میز ایک بڑی ڈیسک بن جاتی ہے۔ جہاں ہر ایک کے لئے جگہ ہوتی ہے۔ اس طرح گھر کے تمام لوگ عام طور پر اس کمرے میں جمع ہوتے ہیں۔ اس طرح درآمد شدہ نظریات کی جگہ رہائش کا قدیم نظریہ پھر اپنی جگہ لے لیتا ہے۔

آیئے اب ایک نظر ذرا کرسی پر ڈالیں، فرنیچر کا وہ معمولی ٹکڑا جو عام طور پر لکڑی، لوہے۔ یا پلاسٹک کا بنا ہوتا ہے، جسے عام طور پر بیٹھنے کے کام میں لاتے ہیں اور کبھی کبھی اس پر کھڑے ہو کر کسی اونچی جگہ مثلاً الیکٹرک لیمپ تک پہنچنے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ کرسی ہر جگہ موجود ہوتی ہے اور اسے فرنیچر کا ایک ناگزیر حصہ سمجھا جاتا ہے۔

جب گذشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں خلیج عربی کی ریاستوں میں یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا تو یہ ''فطری'' بات تھی کہ جلسہ گاہوں، درجات اور دفتروں میں بیٹھنے کے لئے کرسیاں فراہم کی جائیں۔ شاید اس طرف کسی کا خیال بھی نہ گیا کہ کرسی کی عام اونچائی ریڑھ کی ہڈی کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اس کو آرام پہنچانے کے لئے کرسی کی اونچائی اس سے کم ہونا چاہیے جتنی کہ عام طور پر ہوتی ہے۔ شاید کسی نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ زمین پر بھی بیٹھا جا سکتا ہے اور اس سے ایک ثقافتی شناخت بھی قائم ہو سکتی ہے۔ شاید اس طرف بھی کسی کا دھیان نہیں گیا کہ مغرب والے کرسیاں اس لئے استعمال کرتے ہیں کہ وہ ٹھنڈی اور بھیگی زمین پر نہیں بیٹھنا چاہتے۔ اس سے ان کے قالینوں کے عدم استعمال کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔ یہ صورت حال ہمارے ماحول کے بالکل برعکس ہے۔ ہمارے گرم، خشک ماحول میں قالین ایک ضروری ثقافتی چیز ہے۔ لیکن کرسیاں اب تہذیبی ترقی کی علامت بن چکی ہیں گو کہ 19ویں صدی تک سلاو لوگ کرسی پر بیٹھ کر انسانی بھینٹ چڑھایا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں عرب اور چینی زمین پر بیٹھتے تھے اور نفیس ترین تہذیب کے حامل تھے۔

غالباً یہ سب کچھ اُس عرب ایئرپورٹ آفیسر کے علم میں بھی نہ تھا جب اس نے ایئرپورٹ کے

Marfat.com

وی آئی پی لاؤنج میں مجھے زمین پر بیٹھے ہوئے دیکھا جس پر عمدہ قالین بچھے ہوئے تھے۔ وہ میرے قریب آیا اور سرگوشی میں بولا: ''یہ تہذیب کے خلاف ہے'' تھکاوٹ زیادہ ہونے کے سبب میں نے اس سے کوئی بحث نہیں کی، لاعلمی اور غفلت کے عالم میں ہی اسے چھوڑ کر میں اٹھ کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں مشرقی معاشروں میں کرسی کا استعمال ترک کرنے کی حمایت کر رہا ہوں۔ اس کے برعکس میں یہ چاہتا ہوں کہ کرسی کے استعمال، اس کے سائز، اس کی اونچائی اور اس کے ممکنہ متبادلات کے بارے میں اجتہادات کا دروازہ کھولا جائے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس اجتہاد کے ذریعہ ہم بعض ایسے انکشافات کرنے میں کامیاب ہو جو انسانی تاریخ پر اثر انداز ہوں۔ یا یہ کہ ہم اس وقت تک انتظار کریں تا آنکہ مغرب کا کوئی ''ماہر'' ہمیں اطلاع دے کہ کرسیاں لوگوں کی ریڑھ کی ہڈی کے لئے کس قدر نقصان دہ ہیں اور دنیا کے جنگلات پر ان کا کتنا منفی اثر پڑتا ہے اور اس کے بعد ہم اس کے ارشادات کی تعمیل کے لئے تیار ہوں۔

- عرب کے ریگ زاروں میں جدید فرانسیسی اور اطالوی طرز پر پتھروں سے یونیورسٹیوں کی عمارتیں تعمیر کی گئیں اور پھر ان میں ایئر کنڈیشننگ کا انتظام کیا گیا (شاید مجھے اس جگہ نیم جدید، نیم فرانسیسی اور نیم اطالوی کہنا چاہیے) اسی طرح کی تبدیلیاں گھروں کے طرز تعمیر میں بھی کی گئیں اور مکانات جیل کی طرح لگنے لگے۔ اس کے برعکس روایتی عرب گھروں میں بیرونی مداخلت سے تحفظ کی خاطر بنائی گئی رکاوٹوں کا رخ باہر کے بجائے اندر کی طرف ہوتا تھا مثلاً پائیں باغ وغیرہ، جس طرح ڈرائنگ روم متوسط طبقہ کے مصری خاندان کی ضروریات سے متصادم ہے اسی طرح مغربی طرز تعمیر، مسلم صارفین کی ضروریات سے متصادم ہے، ایک ایسے طرز تعمیر کے نفاذ سے، جو ہماری تہذیبی لسانیات کا جزو نہیں ہے اور جس سے ہمارے معاشروں میں اجنبیت کا احساس پیدا ہوا ہے۔
- بہت سے عرب ممالک کی راجدھانیوں میں فلیٹوں کے ایسے بلاک نظر آئیں گے جیسے ماچس کی

Marfat.com

ڈبیاں یا فریزر کے باکس ہوں۔ اگر ان کی زیبائش ہوئی تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ یونانی ستون بنادیئے یا پھول پتیاں بنادیں۔ بہت ہوا تو عرب زیورات کے نقش ونگار آرائش کے لئے استعمال کر لیے۔ لیکن ان میں عرب خطاطی کبھی نظر نہ آئے گی۔ حد تو یہ ہے کہ اب تو سڑکوں کے نام بھی کمپیوٹر کی لکھائی میں لکھے جاتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ خطاطی نصاب کا ایک حصہ ہوا کرتی تھی۔ لیکن عرب دنیا کی ترقی کے ساتھ خطاطی کو اسکولوں سے دیس نکالا مل گیا اور اس کے ساتھ یہ احساس بھی رخصت ہوا کہ خطاطی بھی فن کی ایک شکل ہے۔ اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بعض خطاطوں کو اپنا پیشہ بتاتے شرم آتی ہے۔ اور کیوں نہ ہو، خطاطی کا تعلق تو بس اب چاکلیٹ اور صابنوں کے اشتہاری تختوں سے رہ گیا ہے۔ اب اس کو چاہے غفلت کہیے یا اپنے تہذیبی ورثہ کی جانب بے حسی۔ دونوں ہی باتیں درست ہیں۔ لیکن اگر آپ ذرا گہرائی میں جا کر اس مسئلہ کا جائزہ لیں تو احساس ہوگا کہ دراصل ہمارا تصورِ فن بھی مغرب سے درآمد شدہ ہے۔ خطاطی کبھی عرب فن کا سب سے ممتاز نمونہ ہوا کرتی تھی۔ اس کے زوال کا سب سے بنیادی سبب یہ ہے کہ مغربی تناظر میں اس کو فن کا درجہ نہیں دیا جاتا۔

- ہم میں سے زیادہ تر کی پرورش ایسے ''ترقی پسندانہ'' تہذیبی ماحول میں ہوئی جس کا خیال تھا کہ مصری نظامِ تعلیم کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اس میں حفظ پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ کبھی یہ بات زیادہ کھل کر کہی جاتی ہے کہ حفظ کی یہ مرکزیت مذہبی تعلیم اور اس میں قرآن پاک کی مرکزی اہمیت کی وجہ سے ہے۔ 1963ء تک جب میں کولمبیا یونیورسٹی میں ایم اے کر رہا تھا، خود میرا بھی یہی خیال تھا۔ کولمبیا میں ایک بار مجھ سے بعض رومانی شعراء کی کچھ نظمیں یاد کرنے کے لئے کہا گیا۔ جب میں نے اس کا سبب پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ ''حفظ (یاد کرنا) ایک طالب علم اور نص (Text) کے درمیان ربط قائم کرنے کا سب سے بہترین طریقہ ہے''۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جاپانی نظامِ تعلیم میں حفظ کو پوری طرح رد نہیں کیا گیا بلکہ ایک طریقۂ تعلیم کے طور پر

Marfat.com

اب بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔

تب مجھے احساس ہوا کہ بعض علوم میں طلباء کو بعض اصول اور تصورات ذہن نشین کرنے کے لئے انھیں یاد کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہی مجھے اپنی ''ترقی پسند'' صداقت پر شبہ ہونے لگا۔ مجھے اس کا ادراک بھی ہوا کہ حفظ کا رد کرنا فی الحقیقت اسلامی ورثہ کا شرانگیز اور کھُلم کھلا رد ہے۔ اگر اس ورثہ کو سنبھال کر رکھا جاتا، اس کے ساتھ احترام اور شعور کے ساتھ پیش آیا جاتا، تو شاید ہم حفظ کے ذریعہ تنقیدی شعور پروان چڑھانے میں بھی کامیاب ہو جاتے۔

- عربی ڈرامے کی جدید تاریخ اُن المیہ، طربیہ اور تاریخی ڈراموں سے شروع ہوتی ہے جو فرانسیسی اور انگریزی زبانوں سے عربی میں ترجمہ کئے گئے۔ اس کے بعد ارسطو سے لیکر بریخت اور ارتود تک ڈرامے کے مغربی نظریات بھی ترجمہ کئے گئے۔ نتیجتاً ہمارے لئے لفظ ڈرامہ کے اس کے مغربی تصور کے سوا کوئی دوسرے معنی نہیں ہیں۔ ہمارے لئے ڈرامہ کا تصور بس یہی ہے کہ ناظرین (یا سامعین) ایک اسٹیج کے سامنے بیٹھتے ہیں۔ پردہ اٹھنے کے ساتھ شو شروع ہو جاتا ہے اور پردہ گرنے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے، اداکار یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ڈرامائی تشکیل، خارجی حقیقی دنیا کے مماثل ہے۔ اس سے متاثر ہو کر ہم نے بھی ''جدید'' ڈرامے لکھنے شروع کر دیئے اور خود اپنے ورثہ اور اپنی روایت کی ڈرامائی تشکیل کو پروان چڑھانے میں ناکام رہے۔ ہم اس کا بھی ادراک نہ کر سکے کہ بنو ہلال کی سرگذشت (السیرة الهلالية) صرف ایک غنائیہ یا بیانیہ نہیں ہے بلکہ ایک اعلیٰ درجہ کی تخلیق ہے جس میں ڈرامائی، بیانیہ اور غنائیہ عناصر کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

اگر ہم نے جاپانی تھیٹر کا مطالعہ کیا ہوتا (مثلاً نوہ اور کابوکی جیسے کھیل) تو ہم نے تھیٹر کی ایک بالکل مختلف روایت دریافت کی ہوتی۔ یہ تھیٹر کی ایک ایسی قسم ہے جس میں اداکار سامعین کا سامنا

Marfat.com

کرنے کے بجائے ان کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم نے جاپانی (اور دیگر غیر مغربی فن پاروں جیسے ہندوستانی اور چینی وغیرہ) تھیٹر کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوتا تو شاید عربی تھیٹر نے ایک بالکل مختلف ہی راہ اختیار کی ہوتی اور شاید ہم نے اپنے ورثہ میں ڈرامائی تشکیل بھی دریافت کر لی ہوتیں (مثلاً جادوئی ڈبے والے کھیل اور بنو ہلال کی سرگذشت)۔ شاید ہم اس ابتدائی نقطہ سے آگے بڑھ گئے ہوتے، ہم نے اپنی روایات کی توسیع کی ہوتی، ان کو ترقی دی ہوتی اور اس طرح ان ڈرامائی نظریات کی بناء ڈالی ہوتی جن میں زیادہ تخلیقی شان ہوتی۔ کیا یہ اس سے بہتر نہ ہوتا کہ ہم ''دوسروں'' کی بے جان نقالی کرتے جائیں جو کبھی افسوس ناک ہوتی ہے تو کبھی حد درجہ مضحکہ خیز۔

Marfat.com

4

مغربی ثقافتی نظامِ افکار کا غلبہ

مندرجہ بالا مثالوں سے ظاہر ہے کہ ہم نے دوسروں کے نظام افکار کے مقابلہ میں اپنے تاریخی ورثہ کو ترک کر دیا ہے اور ہمیں اس بات کا احساس بھی نہیں کہ نہ تو ہم نے اپنے ورثہ کا کوئی تخلیقی تنقیدی جائزہ لیا اور نہ اُن کے ورثہ کا۔ ہم نے اُن کے نظامِ افکار کو بغیر سوچے سمجھے اپنا لیا ہے اور اپنی ثقافتی تخلیقات میں فیاضی سے اس کا استعمال کرتے رہتے ہیں۔ ہم نے اُن کے پودے کی اپنی اجنبی ''زمین'' میں شجرکاری کردی ہے اور اس سے بھی بے خبر ہیں کہ ہماری اس حرکت کا انجام کیا ہوگا۔ ہمارے معاشرے، ہمارے طرز زندگی اور ہماری اقدار پر اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ بھلا یہ سب کیسے ہوگیا؟

جدید انسان کے سامنے آج سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ ساری دنیا میں زیادہ تر انسانوں اور مفکرین کے ذہنوں میں مغربی ثقافتی نظام افکار (Western Cultural Paradigms) نے ایک مرکزی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ بنی نوع انسان اور فطرت کے بارے میں اپنے سادہ اور مادیت پرست نقطۂ نظر کے باعث مغربی ثقافتی نظامِ افکار نے مادی سطح پر غیر معمولی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ دور دراز ملکوں پر غاصبانہ قبضہ اور فتوحات کے ذریعہ اس نظامِ افکار کے اطلاق نے مغربی لوگوں کا معیار زندگی بلند کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ظفرمند مغربی نظام افکار سے مغربی لوگوں کی خود اعتمادی میں نہ صرف اضافہ ہوا بلکہ ان کا یہ وشواس بھی راسخ ہوا کہ ان کا تصور کائنات دنیا کی ترقی کا بلند ترین نقطہ ہے جہاں اب تک انسان پہنچ سکا ہے۔ اس طرح ان کا خیال ہے کہ مغرب کی موجودہ تاریخ میں انسانی تاریخ اپنے عروج تک پہنچ گئی ہے۔ مغربی علوم آفاقی علوم ہیں اور مغرب کا ثقافتی نظام افکار ہر زمان

Marfat.com

ومکان کے لئے درست ہے۔

اس ثقافتی یلغار سے اسلامی دنیا کا تصادم ابتدا ہی میں ہوگیا۔ عثمانیوں نے مشرقی عرب ممالک کے خلاف مغرب کی نوآبادیاتی یلغار کا دفاع یہ کہہ کر کیا کہ یہ ممالک ارضِ اسلام کا حصہ ہیں۔ چنانچہ عارضی طور پر مغرب نے سلطنت عثمانیہ سے آنکھیں پھیرلیں اور اپنی توجہ ہندوستان، افریقہ کے بعض حصوں اور نئی دنیا پر مرکوز کردی۔ جب سلطنت عثمانیہ اندرونی بحرانوں کے سبب کمزور ہونے لگی تو مغرب افواج نے اسلامی مشرق پر حملے شروع کردیئے۔ مصر میں نپولین کی افواج کا دخول (1798-1802) مغرب کی ان کوششوں کا نقطۂ آغاز تھا جو اس نے سلطنت عثمانیہ اور اسلامی دنیا کی ٹوٹ پھوٹ کے لئے کیں۔ چنانچہ ایک طرف تو روسیوں نے بحراسود پر واقع بعض ترک امارتوں پر قبضہ کرلیا اور دوسری طرف برطانوی قبرص اور بعد میں مصر پر حملہ آور ہوئے۔ اس طرح مغربی استعماری طاقتوں نے آپس میں اسلامی دنیا کے حصے بخرے کرلیے۔

یہی وجوہ ہیں اسلامی دنیا سمیت تیسری دنیا کے ممالک میں نشأۃ ثانیہ یا احیائی تحریکوں کا آغاز ہوا (جسے عربی میں نہضۃ کہتے ہیں) تو ''مغرب کی برابری'' کرنے کا نعرہ سب سے کشش انگیز اور مقبول نعرہ قرار پایا۔

1- اس کی سب سے واضح مثال سیکولر لبرل افکار میں ملتی ہے جن کے نزدیک مشرق اور تیسری دنیا میں نشأۃ ثانیہ یا احیاء کا مطلب بنیادی طور پر مغربی افکار ونظریات کی درآمد اور مغربی ثقافتی نظامِ افکار کا اپنانا ہے خواہ اس کے نتائج کچھ بھی ہوں۔ اس لئے اس نقطۂ نظر کے حاملین کے نزدیک عرب اور اسلامی دنیا کی ''اصلاح'' ضروری تھی تاکہ وہ مغربی نظام افکار کے معیاروں پر پورے اتر سکیں۔ اس نقطۂ نظر کی ترجمانی، نشأۃ ثانیہ نسل کے لبرل مفکرین میں ملتی ہے مثلاً احمد لطفی السید، شبلی شمائیل، سلامہ موسیٰ وغیرہ، ان میں سے بعض دانشور تو پوری طرح مغرب کے رنگ میں رنگ گئے تھے، اور اپنی شناخت سے اس حد تک بے گانہ ہوگئے تھے کہ انھوں نے مضحکہ خیز تجاویز پیش

Marfat.com

کرنا شروع کردی تھیں مثلاً یہ کہ یوروپین ہیٹ کو رواج دیا جائے، عربی کو رومن حروف میں لکھا جائے اور اسکولوں میں یونانی اور لاطینی زبانوں کا درس دیا جائے وغیرہ۔ ان کے سوا کچھ دوسرے بھی تھے جو زیادہ معتدل تھے اور اس قسم کی حماقت انگیز کرتب بازیوں سے دور رہے۔ لیکن انتہا پسند اور اعتدال پسند دونوں رجحانات کے نمائندوں میں بعض باتیں مشترک تھیں۔ مثلاً دونوں گروہ مغربیت کے پرجوش مبلغ تھے۔ انھوں نے مغربی فلسفۂ حیات کی کسی قسم کی تنقید نہیں کی اور دونوں اس بات کے قائل تھے کہ مغربی طور طریقے اپنا کر ہی اسلامی دنیا کی جدید کاری (Modernization) ممکن تھی۔

2- ایک دوسری مثال عرب دنیا کے اشتمالیوں، (Communists) اشترا کیوں (Socialists) اور مارکسیوں (Marxists) کے رویہ میں ملتی ہے۔ سرمایہ داری اور معاشی وسیاسی آزاد خیالی کی طرف اپنے انتقادی رویہ کے باوجود بیشتر عرب یساریوں (Leftists) نے جدید مغربی افکار وفلسفہ کے تحتی ثقافتی نظامِ افکار کو جوں کا توں قبول کرلیا تھا۔ ان کی تنقید سرمایہ دارانہ نظام کے سیاسی اور معاشی پہلوؤں تک ہی محدود رہی۔ انھوں نے اس ثقافتی اور عملی نظام افکار تک اس کی کچھ توسیع نہیں کی۔

3- 1940ء کی ابتداء تک مغربی ثقافتی نظامِ افکار عرب دنیا میں دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ اس کا سبب بعض اسلامی تحریکوں جیسے اخوان المسلمون اور کچھ قوم پرست پارٹیوں جیسے مصر الفتاۃ (نوجوان مصر) کا ظہور اور عروج تھا۔ اس کا اظہار قوم پرستانہ فکر میں بھی ہوا جس کا تدریجی ارتقا اسی زمانے میں ہوا۔ کچھ ایسے سیاسی ادارے بھی وجود میں آئے جنھوں نے ان افکار کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ یہ تمام تحریکیں اس بات سے واقف تھیں کہ ایک اجنبی، نامانوس، مغربی نظام افکار ان کے درمیان موجود ہے۔ اس لئے انھوں نے عرب شناخت پر زور دیا اور قومی و مذہبی ورثہ کی اہمیت جتائی۔

Marfat.com

ان کوششوں کی اہمیت کے باوجود کہ انھوں نے مغربی ثقافتی نظامِ افکار کو پسپائی پر مجبور کر دیا اور خود مشرق کے تہذیبی ورثے سے نئے رشتے استوار کیے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ ان تحریکوں کا مقصد، خواہ وہ اعلان شدہ ہو یا نہیں کبھی یہی تھا کہ ''مغرب کی برابری'' کی جائے اور اس راہ میں جس قدر ممکن ہو مسلم شناخت کو محفوظ رکھا جائے، اس کی اصلاح کی جائے اور اس قدر ترقی دی جائے کہ وہ ''جدیدیت'' (Mordernity) سے ہم آہنگ ہو جائے۔ فی الحقیقت اس قسم کے رجحانات بھی مغربی ثقافتی رجحانات کو اپنانے کی ہی ایک شکل ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ لوگ عرب شخصیت وشناخت کو مغربی خطوط پر اس طرح مرتب کرنا چاہتے ہیں کہ اس کی خارجی عرب شکل برقرار رہ جائے۔ اس طرح عرب ورثہ کی مغربی تناظر میں دریافت نو ہو جائے بلکہ اگر ممکن ہو تو اس کو دوبارہ مرتب کیا جائے۔ چنانچہ اس طرح کی کوشش عموماً نظر آتی ہیں کہ معتزلہ کو عقلیت پسند قرار دیا جائے، الجرانی کو طرز پسندی (Stylistics) کا بانی اور اسلامی فنون کو تجرید پسندی۔ اسی طرح ان کو خارجیوں کی شاعری میں بے گانگیت (Alienation) اور اجنبیت نظر آتی ہے۔ ابوالعلا کو یہ لوگ دیکارت سے صدیوں پہلے تشکیک پسندی کا بانی قرار دیتے ہیں۔ ایک عرب مارکسی فلسفی نے تو حد ہی کر دی۔ انھوں نے ایک لیکچر میں عرب ورثہ کا دفاع کرتے ہوئے فرمایا ''کہ ابن خلدون نے جدلیاتی مادیت (Dialectical Mateialism) کے 80 فی صدی اصول دریافت کر لیے تھے'' ان کے بقول ابن خلدون مارکس کی پیدائش سے بہت قبل ایک مارکسی تھے۔ چنانچہ ابن خلدون کی عظمت کا جواز ان کی نامکمل مارکسیت ہے (جس کی تکمیل بعد میں خود مارکس نے کی) نہ کہ ان کی عرب اسلامی فکر یا نظریاتی عمرانیات میں ان کا کارنامہ۔ (گو کہ ابن خلدون کے نظریات کی تحتی علمیات کے کئی بیانات مارکسی علمیات کے متضاد ہیں)۔ قصہ مختصر یہ کہ اس مکتب فکر کے نزدیک عرب اسلامی ورثہ کی اہمیت صرف اس قدر ہے کہ وہ مغربی ثقافتی نظامِ افکار کے کتنا قریب پہنچ سکتا ہے۔

4- تعجب تو یہ ہے کہ بعض اسلامی تحریکات کے اعمال میں بھی مغرب سے برابری کرنے کی کوشش کی

Marfat.com

جھلکیاں نظر آئی ہیں، کچھ اسلامی مفکرین شعوری یا غیر شعوری طور پر مغربی ثقافتی نظامِ افکار یا اس کے بعض پہلوؤں کو قبول کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اس نظامِ افکار کو ایک ایسے ماڈل میں تبدیل کر دیتے ہیں جس کی تقلید کی جاسکتی ہے یا کم از کم جس کو حوالے کا ایک نقطہ (Point of Reference) تو بنایا ہی جاسکتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے نزدیک اسلامی نشأۃ ثانیہ، وہ سب سے چھوٹا اور آسان راستہ ہے جس پر چل کر مغرب کی برابری کی جاسکتی ہے، ان میں سے بعض کا تو یہاں تک خیال ہے کہ اسلامی ماڈل بہترین ماڈل ہے۔ اور یہ اسلامی دنیا میں مغربی ثقافتی نظامِ افکار کو متعارف کرانے، اپنانے اور نافذ کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہوسکتا ہے۔ اور اس کے لئے صرف اتنا کرنا ہوگا مغربی ثقافتی نظامِ افکار کی تھوڑی ترمیم کرنا ہوگی تا کہ اس میں روزہ، نماز، عورتوں اور مردوں کی علیٰحدگی، حجاب، وغیرہ کی جگہ نکل سکے۔ اس طرح مغربی نظامِ افکار سے مطابقت رکھنے کے لئے اسلام کی دریافت نو کی جاسکتی ہے، اس طرح ہمیں آگاہ کیا جاتا ہے کہ قرآن پاک میں بہت سے سائنسی قوانین موجود ہیں، مفکرین میں اس پر مقابلہ ہوتا ہے کہ وہ اس پر قرآنی ثبوت پیش کرسکیں کہ قرآن نے آج سے چودہ سو سال قبل ہی عورتوں کو ان کے حقوق دینے کا اعلان کر دیا تھا اور یہ کہ جدید دنیا نے جدید انتظام وانصرام کے جو اصول حال میں دریافت کیے ہیں، قرآن میں ان کا تذکرہ بہت پہلے کیا جاچکا ہے۔ اس اندازِ فکر کا سب سے تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ اسلام، مغربی کے ثقافتی نظامِ اقدار کے جتنا نزدیک ہوتا جاتا ہے، اس کی حقانیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، دوسرے الفاظ میں اس اندازِ فکر کے ذریعہ، خارج سے کسی ثقافتی حملہ کے بغیر ہی اسلامی نظام کو اندر سے مغربی اقدار کے رنگ میں رنگا جارہا ہے۔

مندرجہ بالا تمام ثقافتی مدارسِ فکر میں، ان کے نظریاتی اختلاف کے علی الرغم، یہ بات مشترک ہے کہ ان کے حوالے کا آخری نقطہ مغربی تہذیب ہے۔ دوسرے لفظوں میں انھوں نے مغرب کے ثقافتی نظامِ اقدار کو اپنے اندر سمولیا ہے۔ مغرب کی ثقافتی تشکیل ہم سے آگے نکل گئی ہے اور ہمیں اس کی برابری

Marfat.com

کرنی ہے (یا اسلام پسندوں کو اسے دوبارہ حاصل کرنا ہے) ان تمام افکار کے پس پشت یہ مفروضے کارفرما ہیں کہ تہذیب کا کوئی ایسا خاص نکتہ ہے جس کی جانب مختلف معاشرے مراجعت کرتے ہیں۔ مختلف سماجوں کے انتظام و انصرام کا کوئی ایک ہی مقبول و معروف طریقہ ہے، انسانوں کے برتاؤ اور عمل کا بھی ایک ہی طریقہ ہے اور ان سب کا انحصار ایک یکساں تصور کائنات اور تصور نسل انسانی پر ہے۔ اس تناظر کے مطابق مغرب ایک جغرافیائی اکائی سے ایک ثقافتی تشکیل میں تبدیل ہو چکا ہے، اس کی ایسی انفرادی خصوصیات اور تصورات ہیں جنھوں نے عالمگیر اور انسانی فکر سے جنم لیا ہے۔ مغرب کی برابری کرنے کی ذہنیت کے پیچھے یہی طرزِ فکر کارفرما ہے۔ اس طرح مغربی سائنس، جس کی بیشتر تعلیم یافتہ عرب اور مسلمان وکالت کرتے ہیں "جدید عالمی سائنس" بن جاتی ہے اور مغرب کی ذہنی غلامی "عہد جدید سے تعلق" رکھنے کا مترادف بن جاتی ہے۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عرب دانشوروں نے خود اپنے تہذیبی ورثہ اور عام انسانی ورثہ کو نظرانداز کر کے مغربی ورثہ کے حق میں تعصب کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً نہ تو کسی کو چینی اور جاپانی ثقافتوں کی فکر ہے اور نہ کسی کو سواحلی زبان سے حقیقی اور واقعی دلچسپی ہے جو کہ نہ صرف مشرقی افریقہ کی سب سے بڑی زبان ہے بلکہ اس کا اسلام اور عربوں سے بھی گہرا تعلق ہے۔ اس کے برعکس ہر کوئی "عالمی (یعنی مغربی) ورثہ" کے مطالعہ کے لئے دیوانہ ہو رہا ہے چاہے کسی کو اس کے بنیادی تصورات، اس کی تاریخی جڑوں اور اس کے ظہور کے لئے ذمہ دار سماجی عوامل کا علم بھی ہو یا نہ ہو۔ اس طرح اب محقق کا کام صرف یہ رہ گیا کہ وہ "بین الاقوامی" علم حاصل کرے جب کہ اس سے مراد صرف مغربی ہے۔ اسی علم کو تحقیقی مقالوں اور کتابوں کی شکل میں مرتب کر دیا جاتا ہے جس میں صرف مغربی تصورات کو ہر پھر کر دہرایا جاتا ہے گویا کہ مغرب کے اگلے ہوئے نوالے چبا لیے۔ زیادہ سے زیادہ ان سے مغربی تصورات اور مغربی علم کی ترقی ہوگی جو ان محققین کو ان کے اصلی اسلامی اور عرب ثقافتی ورثہ سے مزید بے گانہ کرنے کا سبب بنے گا۔

Marfat.com

مسلم دنیا میں ایک ایسا تعلیم یافتہ (تہذیب یافتہ نہیں) طبقہ ابھر آیا ہے جس کے لوگ اہم اور نمایاں عہدوں پر فائز ہیں اس طبقے میں صحافی، دانشور، سائنس داں، یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور پروفیسر، ذرائع ابلاغ کے ماہرین، مترجم سبھی شامل ہیں۔ ان لوگوں نے مغرب کے ثقافتی نظامِ اقدار کو اس کے حقیقی مضمرات کا کوئی اندازہ کیے بغیر، پوری طرح جذب کرلیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ اعلیٰ خیالات کا مجموعہ ہے اس لئے وہ کبھی شعوری اور بیش تر، غیر شعوری طور پر مغربی نظامِ اقدار کے پر جوش داعی بن جاتے ہیں تاہم ان میں سے کسی کو بھی، ان مضمرات کا اندازہ بھی نہیں ہوتا جن کی وہ تبلیغ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ مطالعہ کرنے اور یونیورسٹیوں سے ڈگریاں حاصل کرنے تک تو ٹھیک ہیں لیکن ان میں تنقیدی فکر اور علمیاتی نظاموں (Epistemelogical Paradigms) کی صلاحیت ذرا کم ہی ہوتی ہے [یہ بات ہرگز قابل تعجب نہیں اس لئے کہ تنقیدی فکر کے لئے اپنی اور ''دوسرے'' کی ذات کا عرفان، خود اعتمادی، تنقیدی صلاحیتوں اور دانش ورانہ ذہن کی ضرورت ہوتی ہے جن سے کچھ ہی لوگ سرفراز ہوتے ہیں]۔

ان تعلیم یافتہ لوگوں کا طبقہ انتہائی خطرناک ہے کیونکہ یہ بہت فعّال ہوتے ہیں یہ مغربی خطوط پر نظامِ اقدار کی تشکیل نو کرتے ہیں اور مغرب کے ثقافتی نظام اقدار کو اس کے تمام تر تعصبات کے ساتھ فروغ دیتے ہیں۔ ان کو بس یہی تعلیم دی گئی ہے کہ یوروپ کا نشأۃ ثانیہ ایک ایسا عہد تھا جب ادب، شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ کا احیاء عمل میں آیا اور انسان مرکزِ کائنات قرار پایا، [ان کو یہ تعلیم نہیں دی جاتی کہ یہی وہ زمانہ بھی تھا جب میکاولی اور ہابس جیسے مفکرین ظاہر ہوئے، جب مغربی استعماری نظام کی تشکیل ہوئی اور شمالی امریکا میں دسیوں لاکھ دیسی باشندے تہہ تیغ کر دیئے گئے] ان کو بس یہی تعلیم دی گئی ہے کہ انقلاب فرانس، آزادی، اخوت اور مساوات کا انقلاب تھا اور اس کا تعلق اعلان حقوقِ انسانی سے ہے۔ [ان کو یہ نہیں سکھایا گیا کہ یہ پہلا غیر مذہبی (Secular) انقلاب تھا جب کہ انسانوں نے مجرد عقل کی ایسی یقینی پرستش شروع کردی کہ بہت سے انقلابی حقیقت کی اس ڈھنگ پر تشکیل کرنے کے

Marfat.com

لئے تشدد پسندی اور دہشت گردی پر اتر آئے کہ وہ مزید بر بنائے عقل (Based on Reason) لگے۔ان کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ اسی فرانسیسی انقلاب کے نتیجہ میں فرانس میں ایک ایسی مرکزی حکومت وجود میں آئی جس نے مختلف نسلی اور مذہبی آبادیوں کا قلع قمع کر دیا اور مصر و فلسطین پر چڑھائی کر دی۔ان کا پختہ خیال ہے بنی نوع انسان کی تاریخ میں ترقی ایک بنیادی حقیقت ہے۔(وہ اس بات سے واقف بھی نہیں ہیں کہ اکثر اس ترقی کی اتنی قیمت چکانی پڑتی ہے جو تمام مادی منفعتوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے)۔

اس تعلیم یافتہ طبقہ کے افراد، خواہ انھوں نے مغربی تعلیم کا حصول، اندرونِ ملک کیا ہو یا بیرونِ ملک، مغربی نظام افکار، اختیار کر لیتے ہیں پھر ان ہی خیالات کو جو انھوں نے کتابوں میں پڑھے ہیں بغیر کسی قسم کی تنقید کے جوں کا توں عربی میں پیش کر دیتے ہیں۔اس سے بھی زیادہ ستم کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے ہماری یونیورسٹیوں پر قبضہ جمالیا ہے اور مغربی علوم کا درس، اس تناظر اور اسی منہاج کے تحت دینے لگتے ہیں جس طرح مغربی لوگ خود اپنے ملکوں میں کرتے ہیں۔چنانچہ نصاب کی تشکیل بین الاقوامی معیاروں کے نام پر مغربی طرز میں ڈھالی جانے لگتی ہے۔

Marfat.com

5

مغربی نظامِ افکار کے حق میں تعصّبات

ثقافتی نظامِ افکار دراصل نظام افکار کی اک ایسی تجسیم ہے جس میں نظام اقدار بھی شامل ہو۔ چند مثالوں سے یہ نکتہ واضح ہو سکے گا۔

- بات کرتے ہوئے ہاتھ ہلانا مشرق وسطیٰ کے ممالک اور دوسرے مشرقی ممالک میں جوش و جذبہ کی علامت سمجھا جاتا ہے لیکن دوسرے ممالک میں (بالخصوص ان ممالک میں جو اینگلوسیکسن تہذیب کے حامل ہیں) اس کو بدتہذیبی خیال کیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ ہاتھ ہلا ہلا کر بات کرنے والا نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہوگا۔ پہلی حالت میں جسمانی حرکات وسکنات (Gestures) دوسروں سے ابلاغ کا رشتہ قائم کرنے کی دیرینہ خواہش ظاہر کرتی ہیں بلکہ وہ اس احساس کی مظہر بھی ہیں کہ زبان اور الفاظ، ایک ذریعہ ابلاغ کے طور پر، انسانی جذبات اور نقطۂ نظر کی مکمل ترجمانی سے قاصر ہیں۔ مغربی تہذیب کا خیال یہ ہے کہ اگر ابلاغ مکمل نہ ہو تو اس کو نظر انداز کر دینا بہتر ہے۔ یہی سبب ہے کہ مغربی تہذیب میں گفتگو کے وقت اعضاء کی حرکات وسکنات کو خلاف تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ ان ممالک میں سکونت اختیار کرنے والے مشرقیوں کو بہر حال اس کی عادت ہوتی ہے تو ان لوگوں کو سکھایا جاتا ہے کہ گفتگو کے وقت ہاتھوں کو حرکت نہ دیں۔ یا انتہائی اشد ضرورت کے وقت ہی ایسا کریں۔ اس طرح ان حرکات کے پیچھے ایک پورا نقطۂ نظر کارفرما ہے خواہ وہ غیر شعوری ہی کیوں نہ ہو۔
- کچھ جاپانی اور امریکن ماہرین بشریات (Anthropologist) نے یکساں حالات کے تحت رہنے والے بندروں کے اعمال کے مطالعہ پر تحقیق کا ایک منصوبہ بنایا، امریکی ماہرین بشریات

Marfat.com

نے بندروں کو یکساں تعداد والے کئی گروہوں میں تقسیم کر دیا اور ان میں سے ہر بندر کے اعضاء کی حرکات وسکنات کا مطالعہ کرنے لگے تاکہ بعد میں ان اعداد وشمار کا مقابلہ اور تجزیہ کیا جا سکے۔ اس کے برعکس، جاپانی ماہرین بشریات نے بندروں کی تقسیم ان کے خاندانوں کی بنیاد پر کی۔ ہر خاندان اور اس خاندان کے ہر ممبر بندر کو بھی ایک نام دیا۔ تحقیقات میں لگی دونوں ٹیموں نے محسوس کیا کہ بندر آلو کھانے سے قبل اس کو پانی میں ڈبونا پسند کرتے ہیں۔ امریکی سائنس دانوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ کچھ بندر آلو دھوتے ہیں۔ جبکہ جاپانی سائنس دانوں نے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے۔

- بندروں کے کچھ خاندان، سب نہیں، آلو دھوتے ہیں۔
- بندر ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ انھیں ممکنہ طور پر پانی والے آلوؤں کا ذائقہ اچھا لگتا ہے۔

سائنس دانوں کی دونوں ٹیموں نے یکساں حقائق کا مشاہدہ کیا لیکن ان کی تعبیر مختلف انداز میں کی۔ امریکی سائنس دانوں نے بندروں کے ایک عام، مجرد تصور یا بندروں کی ایک مخصوص تعداد کے ساتھ کام کیا اور خاندانی رشتوں اور انفرادی خاصیتوں پر توجہ دیئے بغیر بندروں کے انفرادی اعمال کا مطالعہ کیا۔ اس کے برعکس جاپانی سائنس دانوں نے اپنی تحقیق میں ایک اکائی کے طور پر خاندان کو اختیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اول الذکر نے تو بندر نسل کے انفرادی ممبران کے رویہ پر عام بیانات دیئے لیکن جاپانیوں نے بندروں کے برتاؤ کو کچھ خاص خاندانوں کے ماخوذ ثقافتی رویہ (Acquired Cultural Behavior) سے تعبیر کیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ رویہ (آلو دھونا) صرف ان بندر خاندانوں کے لئے خاص تھا جنھوں نے اسے اخذ کیا۔ اسی طرح جب کہ امریکی سائنس دانوں نے بندروں کے رویہ کا مطالعہ افادیت کے تصور کے حوالہ سے کیا تو جاپانیوں نے تحفظ اور مسرت کے تصورات استعمال کیے۔ دونوں گروہوں کے نتائج میں اختلاف مفروضات میں اختلاف کا نتیجہ ہے۔ اگر ایک طرف امریکیوں

Marfat.com

نے بندروں کو محض مطالعہ اور مشاہدہ کی ایک ''شے'' (Object) سمجھا تو دوسری طرف جاپانیوں نے ان سے ایک نزدیکی رشتہ قائم کر لیا جس سے ان کو ان بندروں کی گروہی اور انفرادی خصائص جاننے میں آسانی ہوئی۔

- اگر آپ کسی بازار سے گذر رہے ہوں اور کوئی غلطی سے آپ کے پیر پر چڑھ بیٹھے لیکن پھر فوراً ہی پلٹ کر کہے ''مجھے واقعی افسوس ہے'' تو اس کا ردعمل مختلف ہو سکتا ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے ''کوئی بات نہیں جناب! بازار میں اس قدر بھیڑ بھاڑ ہے۔ پھر آپ نے یہ جان بُوجھ کر تو نہیں کیا'' ہو سکتا ہے۔ دوسرا جواب یہ ممکن ہے کہ آپ کہیں ''آپ کے اس افسوس کو میں کس بینک میں بھنانے لے جاؤں'' یعنی اس افسوس کا ماڈی متبادل کہاں ملے گا۔ ایک غیر جانب دار مشاہد کا فیصلہ بھی مختلف ہو سکتا ہے۔ اگر ایک شخص اس ردعمل کو بدتہذیبی قرار دے تو دوسرا شخص اس کو حقیقت پسندانہ رویہ قرار دے سکتا ہے۔
- اگر ہم اس مرحلہ پر ایک لحظہ ٹھہر کر اس گفتگو کا تجزیہ کریں تو ہمیں احساس ہوگا کہ جس شخص نے معذرت کی اور افسوس ظاہر کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس کے رویہ کے پس پشت ایک ''قدر'' موجود ہے کیونکہ اس سے انسانی اتحاد ظاہر ہوتا ہے۔ ''قدر'' ایک مجرد اور غیر مادی خاصیت ہے جس کی پیمائش نہیں کی جا سکتی اور جو ماڈی خرید و فروخت کی دنیا اور ''مقررہ قیمت'' سے پرے کی چیز ہے۔ اس کے باوجود، یا شاید اس کی وجہ سے ہی جو شخص ''افسوس'' کو بینک میں بھنانے کی بات کرتا ہے اس کے حوالے خالص مادی ہیں۔ یعنی بینک اور روپیہ۔ (خیال رہے کہ فلسفہ میں جسے ''ماڈی دنیا'' قرار دیا جاتا ہے وہ صرف روپئے پیسے تک محدود نہیں۔ بلکہ اس سے مراد وہ جسمانی ہیئت ہے جس کا ادراک چھو کر کیا جا سکے اور جس کی پیمائش کی جا سکے)۔ اس شخص کے نزدیک ایک اندرونی اخلاقی تصور کی حیثیت سے ''قدر'' کا کوئی وجود نہیں۔ اس کے نزدیک صرف ماڈی حقیقت کا وجود ہے جو ''قیمت'' سے ناپی جاتی ہے اور جس کا انسان کے اندرونی اور اعلا جذبات

Marfat.com

سے کوئی واسطہ نہیں۔

- قدیم یونانی ادیب ''پلوتارک'' (Plutarch) سے ایک قول منسوب کیا جاتا ہے ''شمع گل ہو جانے کے بعد ہر عورت حسین نظر آتی ہے''۔ یہ ایک دلچسپ جملہ ہے۔ تاہم توقع کی جاتی ہے اس قول کے مصنف نے اس کی تصنیف محض ایک گندے لطیفہ کے طور پر کی ہوگی اور اس سے اس کے تصور کائنات کا کوئی علاقہ نہ ہوگا۔ کیونکہ شمع کے گل ہونے اور دوبارہ روشن ہونے کے درمیان بہت سے لمحات گذرتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو پوری زندگی۔ پُرمسرت، پُرالم اور غیر جذباتی وقت! اس طرح وہ شخص جو یہ کہے کہ ''شمع گل ہونے کے بعد ہر عورت حسین ہوتی ہے'' مکمل طور پر مادّیت پرست ہوگا (بلکہ نظام افکار کی رو سے کسی حد تک فحش بھی!) جس کے لئے عورت صرف ایک جسم ہے اور کچھ نہیں۔ جس کے نزدیک شمع گل ہونے سے قبل اور اس کے دوبارہ روشن ہونے کے لمحات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ جس سے انسان کی پیچیدہ انسانی حیثیت ظاہر ہوتی ہے اور جس کے دوران وہ امن، سکون اور عافیت کا متلاشی ہوتا ہے۔ مادیت پسند تو صرف یہی کہیں گے کہ شمع گل ہو جانے کے بعد عورت کیا ہے؟ صرف ایک قابل استعمال شے۔ یہ ہے عہد روشن خیالی کا درس! اس نقطۂ نظر کی تہہ میں کارفرما نظام افکار یاسیت پسندی اور لاوجودیت کا مظہر ہے بالکل اسی طرح جیسے عمر خیام اپنی فلسفیانہ لاوجودیت اور کائنات کی لامقصدیت کو قہقہوں اور شراب کے نشاط میں ڈبو دینا چاہتا ہے۔

- مندرجہ ذیل گفتگو بہت سی ثقافتوں میں سنی جا سکتی ہے:

الف: محترمہ! آپ کیا کرتی ہیں؟

ب: میں تو بس گھر والی ہوں۔

الف: آپ نے آج کیا کیا؟

Marfat.com

ب: کچھ خاص نہیں۔

تحریک آزادیٔ نسواں کے عروج سے قبل 1960ء کی دہائی میں اس قسم کی گفتگو ولایات متحدہ امریکا میں اکثر سنائی دیتی تھی۔اور آج بھی مصر کے مختلف علاقوں میں اس قسم کے ڈائیلاگ سنے جاسکتے ہیں۔

''محترمہ! آپ کیا کرتی ہیں؟

یہاں کچھ ''کرنے'' کا تعلق اس ''کام'' سے ہے جو گھر سے باہر کیا جائے اور جس کے عوض کچھ معاوضہ (مزدوری، قیمت) وصول کیا جائے۔وہ کام جو عورتیں اپنی خانگی زندگی میں اعلاانسانی اقدار کے تحت انجام دیتی ہے (مثلاً بچوں کی پرورش وپرداخت یا خاندان کی دیکھ بھالی وغیرہ) ''کام'' ہی نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ یہ ''کام'' خانگی زندگی کے دائرے میں، گھروں میں رہ کر سرانجام دیا جاتا ہے اوراس کے لئے کوئی ''اجرت'' نہ دی جاتی ہے، نہ وصول کی جاتی ہے کیونکہ یہ کام نہ تو ایک مقدار ہے نہ ہی قابل پیمائش، اگر کوئی عورت یہ کہے کہ گھر کے چہار دیواری میں ماں کی حیثیت سے اس کا کام اس کی ممتا اوراس کے انسانی تشخص کی تکمیل ہے تو اسے ان اقدار کی بازگشت سمجھا جاتا ہے جن کا تعلق ماضی بعید اور فطرت انسانی کے مابعد الطبیعاتی تصور سے ہے، ان کو سائنٹفک نہیں سمجھا جاتا کیونکہ ان کا تعلق مادی دنیا اور مقدار وپیمائش سے نہیں ہے، اس لئے ان کے نزدیک یہ کہنا درست نہیں کہ گھر میں ایک ماں کا کام معاشرے کے لئے اس کے دفتر میں کام سے زیادہ وقیع ہوسکتا ہے کیونکہ ان کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ تمام ماؤں کو معاوضہ کی خاطر دفتروں، بازاروں یا فیکٹریوں میں سرگرم عمل ہونا پڑا ہے۔اگر میں اس نقطۂ نظر کو تسلیم کرتی ہوں تو پھر اس کو تسلیم کیا ہی جانا چاہیے۔کیونکہ یہی غالب، سائنٹفک، معروضی اور مادی نقطۂ نظر ہے، میں تو صرف ایک گھر والی ہوں، میرا کام ''پیدا آور محنت'' نہیں ہے۔

آپ نے آج کیا کیا؟ اس حقیقت کے علی الرغم کہ میں نے گھر کی صفائی کی، سب کے لئے کھانا تیار کیا، بڑے بیٹے کو تیار کر کے اسکول بھیجا، چھوٹی بیٹی کو دودھ پلایا، دفتر سے واپسی پر شوہر کا

Marfat.com

استقبال کیا، اوران سب کے لئے ذہنی سکون واطمینان کا بندوبست کیا، یہ سب کچھ تو بس گھریلو کام ہے جس کے لئے مجھے کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ تو اس مادی نقطۂ نظر کے مطابق میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔

اس بظاہر بے ضرر سی گفتگو میں لفظ ''کام'' کے نظریاتی معنی بدل دیئے گئے ہیں، اس کی ''معصومیت'' کو چھین کر اس کو ایک اصطلاح کی حیثیت دے دی گئی جس کے اصل معنی صرف جدید مغربی تہذیب کے سیکولر ثقافتی نظامِ افکار کے حوالے سے ہی سمجھے جا سکتے ہیں جس کے مطابق کام صرف اس عمل کو ہی قرار دیا جاتا ہے جو عوامی زندگی (Public Life) کے دائرے میں کیا جائے اور جس کا کچھ ''معاوضہ'' دیا جائے۔ یہاں انسان کی حیثیت صرف معاشی انسان کی ہے۔ ایک پیدا کنندہ (Producer) یا ایک صارف (Consumer) نہ اس سے کچھ کم نہ اس سے کچھ زیادہ۔ کبھی کبھی اس کی حیثیت ایک انسانی مشین کی ہو جاتی ہے، جو پیداوار تو کرتا ہے لیکن وہ نفرت ومحبت کے جذبات سے خالی ہے۔ وہ انسانی مشین سے زیادہ کچھ نہیں۔

اس کے برعکس خانگی زندگی ایک ایسا دائرۂ کار ہے جس میں انسانی اعمال کی پیمائش نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے یہ معروضی علوم کے دائرۂ کار سے باہر ہے۔ اس دائرۂ کار میں رفتہ رفتہ ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اس غریب گھر والی نے مادّی نقطۂ نظر سے چاہے کوئی کام نہ کیا ہو لیکن ایک مزید گہرے تناظر میں اس نے وقیع کام سرانجام دیئے ہیں۔ اگر وہ مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر اپنا لے تو اس کو اپنا گھر چھوڑ کر ''کام'' پر جانا پڑے گا تا کہ وہ کچھ معاوضہ حاصل کر کے اپنی کھوئی ہوئی عزت نفس کو بحال کر سکے۔ چاہے اس کا نتیجہ یہ یہی کیوں نہ ہو کہ خاندانی زندگی بکھر کر رہ جائے۔ بچے نوعمر مجرموں میں تبدیل ہو جائیں، وہ اپنی خوداعتمادی اور دوسروں میں اعتماد کھو بیٹھیں اور تہذیب کی نمایاں خصوصیات برباد ہو جائیں (کیونکہ بالآخر یہ ماں ہی تو ہے جو اپنے بچوں کے ذہنوں میں اپنی ثقافتی اقدار منتقل کرتی ہے اور پھر انھیں راسخ کرتی ہے) لیکن مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر سے ان سب باتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ سب ثانوی مسائل ہیں۔ کبھی کبھی تو یہاں تک دعوا کیا جاتا ہے ''غور سے دیکھئے تو آخری تجزیہ میں ہر چیز میں

Marfat.com

معاشیات ہی نظر آئے گی'' بالکل اس شخص کی طرح جس نے بازار میں سوال کیا تھا'' آپ کے اس افسوس کو میں کس بینک میں بھنا سکتا ہوں'' یا پھر یونانی فلسفی اور ادیب پلوتارک (120-46 عیسوی) کی طرح جس نے کہا تھا کہ ''شمع گل ہو جانے کے بعد ہر عورت حسین نظر آتی ہے''۔

- بین الاقوامی زر فنڈ (IMF) کے ایک اعلیٰ عہدیدار کا بیان ہے کہ افریقہ میں ایسے بڑے میدان پائے جا سکتے ہیں جہاں مغربی ممالک میں پیدا ہونے والے کیمیاوی، نیوکلیائی اور دوسرے فضلہ جات کو ٹھکانے لگایا جا سکے۔ اس کے بدلے میں ان ممالک کو ان کے ترقیاتی منصوبوں کو پورا کرنے کے فیاضانہ امداد دی جا سکتی ہے، اس قسم کے بیانات سے جو اضطراب پیدا ہوا اُس نے آئی ایم ایف کو اس طرز فکر کی تردید کرنے پر مجبور کر دیا لیکن اس اعلا عہدیدار نے خود اعتراف کیا کہ اس نے نہ صرف یہ بیان دیا تھا بلکہ اس بیان کے ذریعہ وہ صرف اپنے ادارے کے بنیادی فلسفہ کو ظاہر کر رہا تھا۔ یہ معیشت پرستانہ اور مادّی نقطۂ نظر ساری دنیا کو صرف ایک مادّی وسیلہ سمجھتا ہے جس سے استفادہ اٹھانا ممکن ہے۔ اس استفادہ کا بدلہ صرف مادّی قیمت ہو سکتی ہے نہ کہ کوئی مجرّد انسانی قدر۔

- ہمارے ایک دوست کو جو بین الاقوامی زر فنڈ میں ایک اعلا عہدیدار تھا، مصر میں ایک بڑے ترقیاتی پروگرام کے عمل درآمد پر مامور کیا گیا۔ جب وہ ایک مصری گاؤں میں گیا تو اس گاؤں کے نوجوان نے متنبہ کیا، کہ اس پروجیکٹ پر عمل کرنے سے طبی اہمیت کے کئی پودے، جن کی اہمیت سے جدید طب ابھی تک ناواقف ہے اور جانوروں کی کئی نسلوں کے نابود ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا جبکہ بہت سے سائنس داں بھی ان جانوروں کے وجود سے ناواقف ہیں۔ ہمارے اس دوست کو گاؤں والوں نے یہ آگاہی بھی دی تھی کہ اس کے ترقیاتی پروجیکٹ کے نتیجہ میں خاندانی زندگی کے بکھر جانے کا بھی اندیشہ تھا، میں نے اپنے دوست سے دریافت کیا ''پھر تم نے کیا کیا؟''، ''کچھ بھی نہیں''، اس نے جواب دیا ''میرا پروگرام اتنا اہم تھا کہ اس کو روکنا ناممکن تھا''، میرے

Marfat.com

دوست کا تعصب صاف ظاہر تھا، اس کے خیال میں پروجیکٹ پر عمل درآمد کی کارگذاری، ماحولیاتی اقدار اور سماجی ہم آہنگی کے تحفظ سے کہیں زیادہ اہم تھی۔ اس لئے اس نے اس بات کی قطعی فکر نہیں کی کہ اس کے ''ترقیاتی پروگراموں'' کی انسانی لاگت (Human Cost) کیا ہوگی؟

- مندرجہ ذیل خبر ایک اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ ایک خاتون صحافی، اپنے شوہر کے ساتھ اتھوپیا میں سیروسیاحت کے لئے گئی ہوئی تھی۔ وہ جب اتھوپیا کے سفاری پارک سے گذر رہی تھی تو اچانک کار کا دروازہ کھل جانے سے اس کا شوہر باہر گر پڑا اور شیر اس پر حملہ آور ہو گئے۔ ایک لمحہ کے لئے تو وہ اپنے شوہر کی مدد کے لئے دوڑی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کو اپنے صحافی ہونے کا خیال آ گیا۔ اس نے اپنا کیمرہ سنبھالا اور اس خوفناک منظر کو اپنے کیمرے میں قید کرلیا۔ بعد میں یہ فوٹو، فوٹوگرافی کے ایک مقابلے میں پیش کی گئی اور متوقع طور پر پہلے انعام کی مستحق ٹھہری کیونکہ صحافی نے لاجواب حاضر دماغی اور عمل کی تیز رفتاری کا بہترین مظاہرہ کیا تھا، اس انعام میں کارکردگی، رفتار اور مادی وسائل سے بروقت استفادہ کرنے کی مادی اقدار کے حق میں تعصب پوشیدہ تھا، جب کہ دوسری انسانی اقدار جیسے رحم و کرم ''امداد'' اور خاندانی بہبود وغیرہ پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

- کاریں بنانے والے ایک کارخانے میں ایک ایسی کار بنائی گئی جو ہر اعتبار سے مکمل تھی، بس اس میں ایک نقص تھا کہ موڑوں پر پلٹ جاتی تھی اور سارے مسافر مارے جاتے تھے، کمپنی نے فیصلہ کیا کہ اس نوع کی تمام کاریں بازار سے واپس لے لی جائیں۔ ایک بے حد ذہین اکاؤنٹینٹ (محاسب) نے خالص معاشی نقطۂ نظر سے یہ حساب لگایا کہ مرنے والوں کے خاندانوں کو معاوضہ دینا اس سے کہیں کم ہے کہ تمام کاریں بازار سے واپس لی جائیں اور پھر ان کی مرمت کی جائے۔ اس کے پیش نظر اس نے کمپنی کو مشورہ دیا کہ کاریں واپس نہ لی جائیں، کمپنی نے ایک

Marfat.com

عاقل اور منافع بخش اکائی ہونے کی حیثیت سے اس مشورے کو قبول کیا اور ہلاک وزخمی ہونے والوں کو معاوضہ دینا پسند کیا۔ یہ ایک مثال ہے جس میں بظاہر عاقلانہ اور نفع بخش متبادل، زیادہ انسانی متبادل کے مقابلہ میں ترجیح دیا گیا۔ کار بنانے والی کمپنی کے نزدیک ان انسانی جانوں کے زیاں کی کوئی اہمیت نہ تھی جو اس کی ناقص کاروں سے ضائع ہوئیں۔ اس کو فکر صرف اس کی ہے اس کے خزانے بھرے رہیں چاہے ان پر خون کے دھبے ہی کیوں نہ لگے ہوں۔

- خبر آئی کہ صدر آئزن ہاور نے اپنی صدارت کے دوران نظامت برائے نیوکلیائی قوت [Nuclear Power Authority) کو ایک خفیہ ہدایت دی تھی جس کے ذریعہ اس ادارے کو حکم دیا گیا کہ اس کے خفیہ ایٹمی تجربات اور ان سے پھیلنے والی تابکاری کے بارے میں کسی قسم کے اعداد و شمار جاری نہ کیے جائیں۔ ابتداء میں تو ہمیں یہی خیال ہوا کہ اس قسم کے ''خفیہ سرکلر'' 1950ء کے دور جاہلیت میں ہی ممکن تھے تا آنکہ درج ذیل دوسری خبر پر نظر پڑی۔
- دسمبر 1993ء میں امریکی ہفتہ وار نیوز ویک نے امریکا کے وزیر برائے طاقت [Secretary of Energy] کا ایک بیان شائع کیا جس کے مطابق 1963ء اور 1990ء کے درمیان ریاستہائے متحدہ امریکہ نے 204 زیرزمین نیوکلیائی تجربے کیے اور ان میں سے کسی کا عام اعلان نہیں کیا گیا اور نہ ہی حکومت نے ان کا اعتراف کیا۔ نیوز ویک نے یہ اطلاع بھی دی کہ 1940ء کے اوائل سے نظامت برائے نیوکلیائی قوت نے 600 امریکی شہریوں کو ایسے تجربات کے لئے تابکاری کا نشانہ بنایا جن کا مقصد انسانی جسم پر تابکاری کے اثرات کا مطالعہ کرنا تھا۔ 100 سے زائد لوگوں کو ان کے علم کے بغیر پلوٹونیم (Plutonium) کے انجکشن دیئے گئے۔ اس طرح کے تجربات بعد میں بھی جاری رہے کیونکہ 6 ریاستوں میں تقریباً 24 میٹرک ٹن پلوٹونیم کا ذخیرہ کیا گیا جس کا استعمال ایٹم بم بنانے کے لئے کیا جاتا ہے۔ ان سے پیدا شدہ تقریباً 60 لاکھ پونڈ نیوکلیائی فضلہ بھی ان ریاستوں میں موجود ہے جو امریکی شہریوں کی زندگی کے لئے ایک بڑا

Marfat.com

خطرہ ثابت ہوسکتے ہیں۔

ماضی کے گناہ لمحۂ موجود میں بھی بار بار سامنے آتے رہتے ہیں۔ان میں سب سے زیادہ خطرناک اورسب سے زیادہ گھناؤنا گناہ انسانوں پر تجربات کئے جانے کا ہے۔1945ء سے 1947ء تک ایک ایسا سائنسی تجربہ کیا گیا جس کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ انسانی جسم کے اندر پلوٹونیم کس رفتار سے سفر کرتا ہے۔اس تجربے کے لئے 18اشخاص کو نیوکلیائی تابکاری کا نشانہ بنایا گیا۔ان 18 لوگوں میں گھروالیاں، بلوغت کی منزل پر پہنچنے والے نوجوان، بعض بوڑھے اور حتی کہ ایک چارسالہ بچہ بھی شامل تھا۔اگر امریکہ اپنے شہریوں کے ساتھ یہ سلوک روا رکھتا ہے تو ذرا سوچئے کہ نیم ترقی یافتہ ملکوں کے شہریوں کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا جاتا ہوگا،اسپتال میں بھرتی ایک شخص کو اس طرح نشانہ بنایا گیا کہ ڈاکٹروں نے اس کو بتایا کہ اسے ایک دوادی جائے گی جو ابھی تجربات کی منزل میں ہی ہے،اس تجرباتی دوا کے نام پر اس کے جسم میں پلوٹونیم داخل کردی گئی جس کی مقدار عام انسانی جسم میں پائی جانے والی مقدار سے 239 گنا تھی۔یہ ''انسانی چوہا'' (Human Guineapig)، 1984ء تک زندہ رہا لیکن اس طرح کہ اسے طرح طرح کی جلدی اور نظام ہضم کی بیماریاں لاحق رہیں۔اس پر ایسی غفلت اور سستی طاری رہی جس نے اسے اس کی بقیہ ماندہ زندگی میں کسی کام کے لائق نہیں رکھا۔نیوزویک سے اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اس کے چچازاد بھائی نے اس جرم کا موازنہ نازیوں کے بعض ایسے جرائم سے کیا جن کی پاداش میں ان پر نہ صرف مقدمہ چلایا گیا بلکہ ان کو سزائے موت تک دی گئی۔ان نازی سائنس دانوں نے بعض غیر اخلاقی تجربے کیے تھے ان میں سے ایک تجربہ جڑواں بچوں پر تھا کہ انھوں نے جڑواں بچوں کو علیحدہ کردیا اور ان پر الگ الگ جسمانی تشدد کیا یہاں تک کہ ایک کو بتائے بغیر دوسرے کو مار بھی ڈالا تاکہ دوسرے بچے کے ردعمل کا مطالعہ کیا جاسکے۔ایسے

Marfat.com

تجربات کے ''تفریحی پہلو'' کے علی الرغم، ان تجربات سے بعض ''مفید اور بے حد مفید'' اعداد و شمار بھی حاصل ہوئے لیکن کیا ہم، ان تجربات کے غیر اخلاقی اور غیر انسانی پہلوؤں کو نظر انداز کر کے ان اعداد و شمار کا استعمال کر سکتے ہیں؟

سطور مندرجہ بالا میں جس کار کمپنی کا حوالہ دیا گیا وہ آئرن ہاور، یا امریکہ اور نازی جرمنی میں تجربات کرنے والے سائنس داں نہ کسی طور پر مختلف ہے اور نہ یہ لوگ اس عورت سے مختلف ہیں جس نے اپنے شوہر کی اس وقت تصویر کشی کی جب شیروں نے اس پر حملہ کر رکھا تھا۔ حقیقت کے مادّی نقطۂ نظر کا نچوڑ یہ ہے کہ یہ انسان اور انسانیت کی پاکیزگی کا انکار کرتا ہے اور روح پر مادّے کی فوقیت کا اعلان کرتا ہے کیونکہ مادے کی (اس کی لمبائی، چوڑائی، گہرائی، دبازت اور رفتار کے اعتبار سے) پیمائش کی جا سکتی ہے۔

مندرجہ بالا تمام مثالوں میں جدید مغربی ثقافتی نظام افکار کار فرما ہے جس کو افادیت پسند، عقلیت پرست اور مادّہ پرست بھی کہا جاتا ہے۔ فی الحقیقت یہ وہ نظام افکار ہے جو موجودہ زمانے کے انسانی علم، سائنس اور رویوں کے ایک بڑے حصے پر چھایا ہوا ہے۔ ان اصطلاحات کے علمیاتی پہلوؤں کے شعوری عرفان کے بغیر ان مروجہ علوم کی اصطلاحات کا استعمال ہمیں ایک ایسی صورت حال کی طرف لے جاتا ہے، جس میں ہم ان اصطلاحات کے ساتھ ساتھ اس کے زیریں علمیاتی مفروضوں کو بھی غیر شعوری طور پر قبول کرنے لگتے ہیں۔ چونکہ مغربی استعماریت نے ساری دنیا کو کامیابی سے زیر کر رکھا ہے اس لئے مادّہ پرستانہ نظام افکار بھی غالب نظام بن گیا۔ اس نے اپنے ثقافتی نظام افکار کو بین الاقوامی بنا دیا ہے، جبکہ فی الحقیقت بہت سے معاشروں میں اس کا نفوذ استعماری حکومت کے ذریعہ بہ جبر کیا گیا اور یہ بیشتر ان لوگوں کی مرضی کے خلاف کیا گیا جن پر اس کو مسلط کیا گیا، اس سے یہ غلط فہمی بھی عام ہوئی کہ مغربی نظام افکار آفاقی ہیں۔ اس لئے مشرقی ممالک میں تعصب کی سب سے نمایاں شکلیں مغربی ثقافتی اقدار کی حمایت اور اس کے استعمال میں نمودار ہوتی ہیں۔ گذشتہ صفحات میں تعصب کی بعض

Marfat.com

مثالیں پیش کی گئیں اور ابھی ان میں سینکڑوں مثالوں کا مزید اضافہ ممکن ہے۔

جدید مغربی ثقافتی نظام افکار کی نمایاں خصوصیات اور اس سے پیدا ہونے والے بعض تعصبات کی کچھ مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

1- (جدید مادی) مغربی ثقافتی نظام افکار کی بنیاد اس مفروضہ پر قائم ہے کہ اس کائنات کے مرکز کا وجود، خود اس کے اندر ہے اس سے باہر نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کائنات طبعی اور فطری ہے۔ ماورائی اور غیر مادی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یا تو خدا کا وجود ہے ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو انسانوں کے علمیاتی، اخلاقی، علامتی اور جمالیاتی نظاموں سے، جن کا وجود دنیاوی زندگی میں ہے، اس کا کوئی تعلق نہیں، یہ نقطۂ نظر خالق اور مخلوق (اور بالآخر، انسانی فطرت) کے درمیان کی دوئی یا ثنویت کو برباد کر دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ماورائیت کی روایتی مابعد الطبیعات کو ایسے نقطۂ نظر سے تبدیل کر دیا گیا ہے جس کی رو سے مابعد الطبیعات طبعی یا فطری ہے۔

2- پہلے تو، اس تصور کائنات کے بطن سے انسان دوستی کا فلسفہ نمودار ہوا جس کی رو، سے بنی نوع انسان، اگر کائنات کا خدا نہیں تو اس کا مرکز ضرور تھا، نشاۃ ثانیہ کا سارا ادب اس نقطۂ نظر سے مملو ہے۔ فطری ہونے دعوے کے باوجود انسان دوستی کے فلسفہ میں ثنویت کے عناصر موجود ہیں، (مثلاً بنی نوع انسان بنامِ فطرت، گو کہ مادی نقطۂ نظر کی وجہ سے اس بنی نوع انسان فطرت کے مظاہر ہیں یا فطرت میں بنی نوع انسان کے عناصر بھی تھے)۔ تاہم یہ ثنویت بھی خاصی ہلکی تھی کیونکہ انسان دوستی کا فلسفہ وحدانی نوعیت کا ہے جس میں ثنویت کی زیادہ گنجائش نہیں۔ اس نقطۂ نظر میں مادّہ کو مرکزیت حاصل ہے، دوسری تمام چیزیں مادّے کی تحریک کا نتیجہ اور ضمنی مظاہر ہیں۔ فی الحقیقت سچے مادّہ پرست، جو مادّہ اور اس کی حقیقت، فطرت کے قوانین اور مادّی علمیاتی نظام افکار کی وحدانیت سے آگاہ تھے اس صورت حال پر اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔ ہابس (Hobbes) میکائیولی (Machiavelli) اور ''عہد روشن خیالی'' کے بعض دوسرے فلسفیوں کا خیال تھا کہ فطرت انسانی، نباتات یا مشینوں سے کسی طرح بھی مختلف نہیں، پھر ڈارون (Darwin)، نطشے (Nietzche)، اینگلز (Engels) فرائڈ (Freid) اور دریدا (Dereida) وغیرہ کا زمانہ آیا جنہوں نے بنی نوع انسان کے ہر مروجہ تصور کو برباد کر دیا اور مادّی قوانین کے تطابق کی بناء پر ان

Marfat.com

تصورات کی تشکیل نو کی۔ مادّی نقطۂ نظر کے مطابق کائنات چھوٹے چھوٹے ذرات (ایٹموں) پر مشتمل ہے جو خلاء مین تیر رہے ہیں۔ یہ مکانیکی نقطۂ نظر ہے۔ نامیاتی نقطۂ نظر سے کائنات ایک مُسلّم کُل ہے، ان دونوں نقطہ ہائے نظر سے کائنات ناقابل تغیر اور مکمل اسباب وعلل کے نظام کے تابع ہے، یعنی اگر الف سبب ہے تو اس کا لازمی نتیجہ ب ہوگا۔ اس کائنات کا تصور ایک ایسا تسلسل ہے جس میں تمام دائرے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان کوئی خلا نہیں ہے۔ تمام مخلوقات ایک ارتقائی ترقی پسند حرکت کے تابع ہیں جو آگے بڑھتی رہتی ہے اور رجعت کے برعکس ہے۔ تمام مخلوقات اسی لئے تغیر پذیر ہیں کیونکہ آخر کار ہر چیز مادّے سے بنی ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق، بنی نوع انسان اور مادّے میں چنداں فرق نہیں۔ اگر بنی نوع انسان فطرت سے کچھ مختلف ہوتی تو اس سے مادّے کا فطری نظام اور اس کا تسلسل بے ترتیب ہو جاتا۔ غالباً اسی لئے مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر میں انسانوں اور حیوانوں کی مشترکہ خصوصیات پر، ان خصوصیات کے مقابلہ میں زیادہ زور دیا جاتا ہے جو ان دونوں جانداروں کو الگ کرتی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسانی اور فطری مظاہر ایک مسلسل کُل کی حیثیت اختیار کرتے ہیں جن کا اطلاق انسانوں اور حیوانوں پر یکساں طور پر ہوتا ہے، انسانی مظاہر عدیم النظیر اور بے مثل نہیں گو کہ ممکنہ طور پر وہ زیادہ پیچیدہ ہو سکتے ہین لیکن بالآخر وہ انھیں مادّی قوانین کے تابع ہیں جو مذہبی، اخلاقی یا انسانی مقاصد کے پرے ہیں۔ اس طرح بنی نوع انسان بھی ایک فطری مادّیاتی نظام کا جزء لاینفک ہے۔ بنی نوع انسان فطرت کا حصہ ہے، اسی سے اس کا جنم ہوا، اس میں اس کا وجود رہتا ہے اور فطرت سے خارج، اس کا کوئی آزادانہ وجود نہیں ہے، اس طرح انسان کو مادّی دنیا اور اس کے بے رحم قوانین کا تابع بنا دیا گیا ہے۔ مادّے سے آزاد، ان کا اپنا کوئی ارادہ نہیں اور مادّہ ان کے تئیں غیر جانب دار ہے، اس طرح فطرت اور بنی نوع انسان کی ثنویت (Duality) جو مغربی انسان دوستی کی بنیاد ہے، تباہ ہو جاتی ہے۔

اس مرحلے پر اس نکتہ پر دھیان ضروری ہے کہ فطری مادّیاتی نظام کا آغاز اس سے ہوا کہ فطری اشیاء کو بنی نوع انسان کی دنیا سے نکال کر مادّی دنیا میں پھینک دیا جائے۔ پھر خود انسان کے ساتھ بھی

Marfat.com

وہی سلوک کیا گیا کہ اسے فطری قوانین کا تابع بنا دیا گیا۔ مغرب کے جدید مادی علمیاتی نظام کا آغاز اس اعلان سے ہوا کہ خدا کے تصور کی موت واقع ہو چکی ہے اور انسان کو کائنات میں مرکزی حیثیت حاصل ہے لیکن اس کا اختتام اس پر ہوا کہ انسان کو اس کی مرکزی حیثیت سے محروم کر دیا گیا اور "بے جان اشیاء" کی طرح اسے بھی ماڈی قوانین کا تابع قرار دیا گیا۔

اس طرح ماڈی وحدانیت (Materialist monism) کہ انسان کے بشمول تمام مخلوقات انھیں قوانین کے تابع ہیں جو اشیاء پر لاگو ہوتے ہیں، اسی طرح مغربی علمیات کا مرکزی تصور یہ ہے کہ ایک ہی قانون ہے، ایک ہی کلچر ہے، ایک ہی انسانیت ہے اور اس کی وحدانیت اس حقیقت سے جنم لیتی ہے کہ بنی نوع انسان ایک فطری نظام کا جز ہیں جس کے باہر ان کا کوئی وجود نہیں، اس سے سائنس اور علم کی وحدانیت پیدا ہوتی ہے جس کے نزدیک بنی نوع انسان اور فطرت میں کوئی فرق نہیں (مسلم اس کو "سائنس اور علم کی وحدت" قرار دینا زیادہ پسند کرتے ہیں)۔

اس فلسفیانہ نظام سے ایک علمیاتی اور اخلاقی نظریہ نے جنم لیا جس سے ترجیحات مرتب کی گئیں۔ اس پر بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے کہ مغرب میں ہر مادی علمی تحریک کا رخ اس طرف رہا ہے کہ خالق کی پیدا کردہ ثنویت اور انسانی فطرت کی ثنویت کو ختم کر دیا جائے۔ یہ مافوق الفطرت مابعد الطبیعات کا مکمل خاتمہ تھا۔ اس نقطۂ نظر کے تحت انسانی شعور کے بارے میں چند نتائج مرتب کئے جا سکتے ہیں:

(1) انسانی شعور فطرت و ماڈے کا جز لاینفک ہے۔ یہ فطرت سے حاصل شدہ معلومات کو بطریق احسن، اور غیر جانب دارانہ طور پر محفوظ رکھتا ہے۔ تاہم یہ اس کے پرے جانے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ فطرت کی طرح شعور بھی لامحدود ہے، لیکن یہ غیر جانب دار اور مجہول (Passive) ہے۔ انسانی شعور کی صفات وہی ہیں جو فطرت کی صفات ہیں۔

(2) انسانی شعور کسی عمل کی صرف عام اور مشترک صفات کا ادراک کر سکتا ہے جن کی نوعیت فطری اور ماڈی ہو اور صرف ان کے ذریعہ عام مجرد قوانین تک رسائی ہو سکتی ہے۔

Marfat.com

(3) وجود مادّی ہے، اس لئے حواس خمسہ کے ذریعہ اس کا ادراک ممکن ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے محض واہمہ ہے اس لئے حقیقت (خواہ وہ انسانی حقیقت ہو یا فطری حقیقت) کا ادراک عقل کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس طرح دنیا کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ مفید مادّہ ہے، تمام اشیاء خواہ وہ انسانی ہوں یا فطری مساوی حیثیت رکھتی ہیں یعنی وہ اضافی بھی ہیں۔

(4) فطرت اور انسان کے بارے میں جو کچھ اس وقت ''لاعلم'' ہے بتدریج علم کے خزانے میں اضافے کے ساتھ ''معلوم'' ہوتا جائے گا اس طرح ''لاعلمی'' کا دائرہ کم ہوتا جائے گا اور ''علم'' کا دائرہ بتدریج بڑھتا جائے گا یہاں تک کہ (مادی اور انسانی) حقیقت کا مکمل ادراک ہو سکے۔

(5) انسانی شعور بنی نوع انسان کے سماجی اور مادّی ماحول کے ساتھ اس کی دوبارہ تخلیق پر قادر ہے تا کہ بنی نوع انسان کو اشیاء عالم کے تجزیہ کے ذریعہ معلوم کئے گئے مادی اور فطری قوانین سے تطابق سکھایا جا سکے۔

علمیاتی نظام کو یہیں چھوڑ کر اب ہم ایک نظر اخلاقی نظام پر ڈالتے ہیں۔ مادّی نظام کے نقطۂ نظر سے کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے پاک، اعلا و ارفع، متبرک، مطلق اور علتِ غائی ٹھہرایا جا سکے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق کائنات میں بنی نوع انسان کے وجود کا مقصد یہی ہے کہ وہ مختلف طرح کی معلومات جمع کرے تا کہ اسے کائنات پر مکمل قابو حاصل ہو سکے۔ وہ فطرت کی تسخیر کرے اور اس طرح وسائل کا زیادہ سے زیادہ استعمال کر سکے۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہوا کہ ہر شے کو (فطرت اور بنی نوع انسان سمیت) قانونِ اسباب وعلل میں جکڑ دیا جائے تا کہ ہر شے کو قانون فطرت کے تابع بتا کر اس کی وضاحت کی جا سکے۔ اس طرح انسان نہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا خلیفہ رہ جاتا ہے، اور نہ اس کو کوئی عزت بخشی گئی ہے، وہ تو محض فطری و مادّی وجود بن کر رہ گیا ہے۔

اس نظام میں اخلاقی قوانین ندارد ہیں کیونکہ زندگی کا مقصد تو تفریح کرنا اور نفع کمانا، پیداوار کرنا اور اسے صرف کرنا ہے۔ پیداوار اور صرف کے لامتناہی دائرے کو مسلسل جاری رہنا چاہیے۔ مادّی

Marfat.com

نقطۂ نظر کا ایک اہم پہلو جس کو جدیدیت کی مغربی و غیر مغربی تحریروں میں بیش تر نظر انداز کیا گیا ہے، یہ ہے کہ مادّی نقطۂ نظر مغربی استعماریت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے، پہلے تو بنی نوع انسان کو کائنات کا مرکز قرار دیا گیا اور پھر نارواطور پر ان کو الوہیت کا درجہ بخشنے کی کوشش بھی کی گئی۔ چنانچہ الوہی مابعدالطبیعات کے مطابق، بنی نوع انسان کو بے حدود، اور بجائے خود احترام کا مستحق بھی قرار دیا گیا جو اقدار کے کسی خارجی نظام کا پابند نہ تھا۔ قوت وہ واحد معیار بن گئی جس کی بنیاد پر انسانوں کی درجہ بندی کی جانے لگی۔ بجائے اس کے بنی نوع انسان کو مرکزی حیثیت دی جاتی مغربی (سفید فام) انسان نے اپنے آپ کو اس مرتبہ پر فروکش کر لیا۔ بجائے اس کے کہ دنیا اس طرح چلائی جاتی کہ اس سے ساری بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچتا دنیاوی معاملات اس طرح چلائے جانے لگے کہ اس سے صرف سفید فام اقوام کو فائدہ پہنچے۔ انسان دوستی کے بلند بانگ دعووں نے استعماریت کا لبادہ اوڑھ لیا۔ مغربی افواج زمین کے سینے پر دندنانے لگیں۔ تہذیب کے فرزندوں نے براعظم امریکا کے دیسی باشندوں کا قتل عام کر دیا اور افریقہ کے لاکھوں باشندوں کو ان کے گھروں اور وطن سے محروم کر کے غلام بنا لیا تاکہ وسیع امریکی کھیتوں کو سستے زرعی مزدور فراہم کیے جا سکیں۔ نقل مکانی کے دوران ہزاروں افراد ہلاک ہو گئے اور جو باقی بچے ان کی زندگی نئی دنیا میں اجیرن ہو گئی۔ ساری دنیا میں قدیم معاشی، سیاسی اور ثقافتی ڈھانچوں کے انہدام کے لئے فوجی قوت کا استعمال کیا گیا۔ ایشیاء اور افریقہ کو یا تو سستے مزدوروں اور سستے خام مال کی کان سمجھ لیا گیا یا پھر ایسے بازار جہاں مغربی کارخانوں کی مصنوعات اونچے داموں میں فروخت کی جا سکیں اور منافع کمایا جا سکے۔ قدیم بین الاقوامی نظام دنیا پر فوجی طاقت کے ذریعہ تھوپا گیا تھا۔ اس کی جگہ جدید بین الاقوامی نظام بھی فوجی طاقت کے ذریعہ ہی مسلط کیا جا رہا ہے جس میں مقامی سیاسی حکمرانوں اور اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کو مغربی مفادات کا نگہبان مقرر کر دیا گیا ہے۔

Marfat.com

6

مادی علمیاتی نظامِ افکار کے تعصّبات

جدید مغربی علمیاتی نظام افکار کے بیشتر تعصبات اس کے مادہ پرستانہ وحدانیت کے فلسفہ سے جنم لیتے ہیں۔

(1) غیر مادی اور انسانی رویوں کے بجائے مادہ پرستانہ اور فطری رویوں کے حق میں تعصب سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ انسانیت کی تعبیر فطرت پرستی اور مادیت کے استعاروں میں کی جانے لگی ہے۔ اور اس ضمن میں انسانیت کی وضاحت کرنے میں بھی تعصب کا اظہار ہوتا ہے۔ اس طرح بنی نوع انسان کو کمیت، مقدار، تعداد اور کنٹرول کے تابع بتایا گیا۔ سماجی عمل کی تحقیقات و تفتیش میں وہ اصول وضوابط استعمال کیے جانے لگے جو تجرباتی اور طبعی علوم میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ علوم کی وحدت کا خیال بذات خود، انسان اور فطرت کی دوئی کے خاتمہ کا علمیاتی اور اخلاقی اظہار ہے۔ یہ اصولیات (Methodology) ہی ہے جس کے ذریعہ مادہ پرستانہ وحدانیت کو تمام اعمال پر لا دیا گیا ہے۔ اسی طرح مادی اشیاء کی منطق کا اطلاق بنی نوع انسان پر کر دیا گیا ہے۔ اور ساری دنیا کو فقط مادّی بُعد (Material Dimension) تک محدود کر دیا گیا۔ اس فطرت پرستی اور مادّیت کا نتیجہ الوہیت کے خلاف تعصب میں ظاہر ہوا۔ اخلاقی، نفسیاتی اور انسانی ابعاد پس پشت ڈال دیئے گئے کیونکہ اس کائنات میں صرف انسان وہ مخلوق ہیں جو آزاد ارادہ کے مالک ہیں جو دنیا میں کسی مقصد کی تلاش میں ہیں اور جو اپنے اعمال کو اخلاقی قوانین کے تابع رکھتے ہیں۔ اسی نقطۂ نظر سے جبری نظریات بھی جنم لیتے ہیں جن میں انسانوں سے لیکر مچھروں تک کائنات کی ہر شے کی وضاحت نہایت سائنسی اور جبری طریقے پر کی جاتی ہے۔ اب رہا سوال بنی نوع انسان کے خوابوں، امنگوں اور آرزوؤں کا۔ اخلاقی خواہشات اور آزاد ارادے کا، تو ان کو غیر سائنسی، غیر اخلاقی اور مریض روحانیت قرار دیا جاتا ہے۔

Marfat.com

(2) اس نقطۂ نظر میں ''عام'' کے حق میں اور ''خاص'' کے خلاف تعصب پوشیدہ ہے۔ یہاں یہ مفروضہ قائم ہے کہ جیسے جیسے کوئی عمل اپنی ''خصوصیت'' سے محروم ہوتا جاتا ہے اور ''عمومیت'' کا کردار اختیار کرتا جاتا ہے تو وہ زیادہ صحیح اور زیادہ سائنٹفک بنتا جاتا ہے۔ ''اعمال'' کو ان کی خصوصیت اور انسانی عناصر یا روحانی خصوصیت سے محروم کیا جاتا ہے تاکہ ہم عمومیت کی ایک ایسی سطح پر پہنچ سکیں جو سائنٹفک اور تمام ہو اور جہاں ثنویت یا دوئی، کی تمام علامتیں مٹادی گئی ہوں، اور تمام خلاء پر کردیئے گئے ہوں۔ اس سطح پر عمومیت کا حصول کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ قانون ہے جو انسانی کا رشتہ ''فطری'' سے اس طرح جوڑتا ہے کہ اول الذکر، آخرالذکر کے تابع ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی عمل کے وہ خاص خاصیتیں جو اس عمل کو یکتائی عطا کرتی ہیں سائنٹفک اور جسے تمام دوسرے علوم ایک مرکزی اصول کے طور پر اپنا سکیں۔ یہ مرکزی خیال کے مطالعہ کی راہ میں حارج ہوتی ہیں کیونکہ تجربہ کے عمل کے ذریعہ ہی عام فطری قوانین تک پہنچا جاسکتا ہے۔

(3) قابل ادراک، (Comprehensible) قابل پیمائش (Measurable) اور قابل مقدار (Quartifiable) میں بھی ناقابل ادراک، ناقابل پیمائش اور ناقابل مقدار کے خلاف ایک تعصب پایا جاتا ہے، وہ سارے اعمال اور مظاہر جو ناقابل پیمائش ہیں مغربی سائنس کے محدود امکانات سے خارج ہو جاتے ہیں کیونکہ سائنس کا تعلق صرف قابل ادراک، قابل پیمائش اور قابل مقدار سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی سائنس کی ریسرچ عام طور پر حواس خمسہ کی دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ تمام مظاہر جو پیچیدہ، ناقابل مقدار اور لامحدود ہیں اس کے دائرۂ کار سے باہر ہیں، اسی طرح وہ تمام مظاہر جن کا مشاہدہ حواسِ خمسہ کے ذریعہ نہیں کیا جاسکتا، جن کی آسانی سے پیمائش نہیں کی جاسکتی یا جن کی شماریاتی پیمائش (Statistical Measurement) غیر ممکن ہے، مغربی سائنس کی حدود سے باہر ٹھہرتے ہیں۔ چونکہ اخلاقی اور روحانی مسائل ان صفات سے عاری ہیں اس لئے وہ بھی مغربی سائنس سے خارج ہیں۔

Marfat.com

(4) مادی نقطۂ نظر میں یک رنگے، اور آسان مظاہر کے حق میں اور متعدد رُخے، پیچیدہ اور غیر یکساں مظاہر کے خلاف تعصب موجود ہے۔ اسی طرح آسان تفاسیر اور اصولوں کے حق میں بھی تعصب موجود ہے جو انسانی برتاؤ کو، ایسے ماڈلوں میں تبدیل کر سکیں جن کی تفہیم وتشریح آسانی سے ممکن ہو، چنانچہ مغربی سائنس میں کسی ایک اصول کے لئے دیوانہ وار تلاش کی جاتی ہے جو اس کا رشتہ علوم کی وحدت یا ماڈی وحدانیت سے قائم کر سکے۔ اسی طرح کسی ایک مرکزی خیال، یا مرکزی سبب کی بھی دیوانہ وار تلاش جاری ہے جو اس کائنات کی وضاحت کر سکے یہ عام طور پر معاشی تغیریہ (Economic Variables) ہی ہوتے ہیں، جیسے بینتھم (Bentham) کے افکار میں ماڈی افادیت، آدم اسمتھ کے یہاں منافع کا حصول اور دولت کا ارتکاز، مارکس کے یہاں آلاتِ پیداوار کا ارتقاء، اسی رجحان نے بعض دوسرے مفکرین کے یہاں مرکزی تصورات کی شکل اختیار کر لی ہے مثلاً فرائڈ کے یہاں ایغو (Ego) کارلائل کے یہاں ''غیر معمولی انسان'' (Heroès) نازیوں کے یہاں ''آرین قوم'' صیہونیوں کے یہاں ''ارض موعود'' وغیرہ۔ ماڈی یکسانیت سے پیدا ہونے والا یکساں علت غائی کا نظریہ کسی دوسرے مختلف مظہر کے وجود کو سختی سے رد کرتا ہے کیونکہ اس مختلف اور دوسرے مظہر کے وجود کا مطلب ہوگا نظامِ افکار اور انسانی قوانین کی بوقلمونی اور رنگارنگی!

(5) ماڈی نقطۂ نظر میں معروضیت (Objective) کے حق میں اور موضوعیت (Subjective) کے خلاف تعصب پایا جاتا ہے، معروضیت کا مفہوم یہ ہے کہ محقق اپنے تمام خیالات، نظریات، جذبات، اخلاقیات، پسند ناپسند، غرضیکہ اپنے انسانی وجود کی کاملیت (Totality) سے آزاد ہو جائے، اس کا ذہن ایک ایسے سادہ کاغذ (Tabularasa) کی مانند ہو جائے جس کا کام غیر جذباتی اور مکمل ''بے گانگی'' (Detachment) کے ساتھ ''حقائق'' کا اندراج کرنا ہے اور کچھ نہیں! انسانی علوم و معاملات کے مطالعہ میں بھی اسی معروضیت کا مظاہرہ متوقع ہے جہاں ''معروضی محقق'' مکمل بے گانگیت اور

Marfat.com

معروضیت کے ساتھ مشاہدہ کرے۔اس طرح اس نقطۂ نظر میں ''انسان'' کی حیثیت دوسری ''بے جان اشیاء'' کی مانند ہو جاتی ہے اور انسانی موضوعات سے اس کی روح پس پشت پڑ جاتی ہے جو دانستہ یا نادانستہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے تمام اعمال کا احاطہ کیے رہتی ہے۔

یہاں یہ بھی دھیان رکھنا چاہیے کہ علت غائی کی یکسانیت دو انتہاؤں کے درمیان جھولتی رہتی ہے، اول تو ایک ایسے ضابطۂ کار کی تلاش جو مکمل طور پر معروضی ہو، غیر جانب دار ہو اور جس کے ذریعہ آسان، سادہ، عام قوانین تک رسائی ہو سکے جو روحانیت کی آمیزش سے آزاد ہوں۔ یہ قوانین ہر مظہر کو علت غائی میں جکڑ کر رکھتے ہیں اور ان کا مطلق تواتر کسی بھی جگہ کوئی خلا نہیں چھوڑتا۔ بلاشبہ اس قسم کی کوششوں کے نصیب میں ناکامی ہی لکھی ہے۔ بالخصوص اس وقت جب وہ انسانی اعمال و برتاؤ کا مطالعہ کرنا چاہے۔ چنانچہ مطلق معروضیت کی جگہ مطلق موضوعیت لے لیتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عام قوانین کی موجودگی کا یکسر انکار کر دیا جائے اور مختلف مظاہر کے درمیان ربط پر بھی کوئی دھیان نہ دیا جائے کہ ہر مظہر اپنے آپ میں آزاد اور خاص سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح بنی نوع انسان مادی عقلیت (Materialist Rationalism) جدیدیت اور روشن خیالی سے نکل کر مادی غیر عقلیت، مابعد جدیدیت (Postmodernism) اور عدمیت (Nihilism) میں داخل ہو جاتا ہے جس کو مغربی افکار کے ایک مورخ نے ''تاریک روشن خیالی'' (Dark Enlightenment) کا نام دیا ہے۔

روحانیت، پیچیدگی، خاصیت اور موضوعیت کے خلاف تعصب فی الحقیقت انسانیت بنام مادّیت و فطرت پرستی کی کشمکش میں انسانیت کے خلاف تعصب بن جاتا ہے۔ مادہ پرستانہ نظام افکار (Materialist Paradigm) میں بعض دوسرے قسم کے تعصبات بھی موجود ہیں مثلاً سکون کے مقابلہ میں حرکت کے حق میں تعصب، عدم تسلسل کے مقابلہ میں تسلسل اور ارتکاز کے حق میں تعصب، خطوط منحنی اور غیر تشکیل شدہ اشکال کے مقابلہ میں خطوط مستقیم اور دائروں کے حق میں تعصب۔

(6) مادّی تہذیب کا انسان دشمن رویہ اصطلاحات کی نوعیت اور انتخاب تک میں ظاہر ہوتا ہے،

Marfat.com

بہترین اصطلاح وہ سمجھی جاتی ہے جو عام ہو، درست ہو، مقداری ہو، بیانیہ ہو اور غیر استعاراتی ہو، بیشتر اصطلاحات فطری اشیاء کے بیان کے لئے وضع کی گئیں تھیں پھر ان کا اطلاق انسانی علوم میں کیا گیا۔ مبہم (Ambiguity) کے برخلاف درستگی (Accuracy) کے حق میں تعصب کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام علوم میں اس بات کی شعوری کوشش کی گئی کہ وہ طبعی اور فطری علوم کی نقالی کریں۔ چنانچہ زبان کے سلسلے میں الجبرا کی زبان آدرش ٹھہری جہاں اسم اور مسمّٰی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا، جہاں الف الف ہے اور ب ب ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبعی اور انسانی دونوں طرح کے علوم میں ریاضیاتی نظام افکار کا استعمال زیادہ سے زیادہ ہوتا گیا جس میں حقیقت کا ادراک اور بیان / اعداد اور مقدار کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سماجی علوم میں بھی سوالناموں، شماریاتی طریقوں اور اشاریوں نیز ریاضیاتی نمونوں کا استعمال بڑھتا جارہا ہے۔

(7) مزید برآں، مختلف مظاہر اور عوامل کی تعریفوں میں بھی تعصبات کا دخل پایا جاتا ہے کیونکہ ان میں بھی انھیں مغربی اصطلاحات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جدید مغربی علمیات دنیا میں اپنی نوعیت کی واحد شے ہے جس نے اپنے لئے ایک نظریاتی نظام، اصولیاتی نظام، تحقیقی ضابطے اور تجزیاتی طریقۂ کار متعین کیے ہیں۔ پھر ان کی پشت پناہی کے لئے ثقافتی، تہذیبی، سیاسی، تاریخی اور فوجی تحقیقاتی اداروں کا ایک جال موجود ہے۔ ان اداروں میں وہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ کسی بھی خیال کی تصدیق کر سکتے ہیں، کسی بھی تصور کو فروغ دے سکتے ہیں، کسی بھی نظریہ کو پھیلا سکتے ہیں یا کسی بھی معلومات یا اس کے کسی جز کو (جو ان کے مفادات کے خلاف ہو) دبا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس، دوسرے علمیاتی نظام ابھی اپنے تشکیلی مراحل میں ہیں جن میں اسلامی علمیاتی نظام بھی شامل ہے، اس امر کے باوجود کہ اسلام کا اپنا تصور کائنات موجود ہے، ابھی تک اس کے لئے کوئی نظریاتی نظام (Theoretiecal Frame Work) اور دوسرے ملحقات (تحقیقی ضابطے، اصولیات اور تجزیاتی طریق کار) وضع نہیں کیے جا سکے۔

Marfat.com

ہماری تہذیب میں علمیات کی یہ موجودہ صورت حال ہے۔ مغربی تہذیب میں غیر مقلد دانشوروں کی بھی یہی صورت حال ہے کہ جہاں تہاں چند مفکرین ہیں جو مروجہ نظام سے اختلاف رائے رکھتے ہیں اور وقتاً فوقتاً اس کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ان کے پاس بھی کوئی مربوط نظام فکر نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان کی حمایت کے لئے کوئی طاقتور ادارے ہیں جو ان کے نظریات کی پیروی کرسکیں، ان کو آگے بڑھا سکیں اور ضرورت پڑنے پر ان کی حمایت کرسکیں۔ مکمل وضاحت، صاف، غیر مبہم اور واضح بیانات پر اصرار کا لامحالہ نتیجہ یہ ہوگا کہ مغربی تصورات اور اصلاحات کو استعمال کرنا پڑے گا۔ کسی نہ کسی درجہ میں ابہام قابل قبول ہونا چاہیے۔ واضح رہے کہ ابہام، غیر واضح (Vagueness) کا متبادل نہیں ہے جیسے پیچیدگی تضاد کے ہم معنی نہیں ہے، جب ہمارا متبادل علمیاتی نظام، اس کا نظریاتی نظام، اس کی اصطلاحات اور تحقیقاتی طریق کار اسی درجہ پر پہنچ جائے جس درجہ پر مغرب کا علمیاتی نظام پہنچ چکا ہے تو زیادہ ترقی یافتہ تعریفوں کا مطالبہ جائز اور درست ہوگا۔

Marfat.com

7

مادّی علمیاتی نظام افکار میں تعصب کے مظاہر

۱۔ مادّی ترقی: تعصب کا مرکزی نقطہ

''ترقی'' موجودہ مغربی جدیدیت کا سنگ بنیاد ہے۔ جدید کاری ''ترقی'' کے لئے کی جاتی ہے، صنعت کاری ''ترقی'' کے لئے کی جاتی ہے۔ معاشی تبدیلی کا مفہوم ''ترقی'' ہے۔ عمارتوں کی تعمیر وتخریب، پنج سالہ منصوبے، بڑی بڑی تبدیلیاں، سب کچھ ایک جادوئی لفظ کے لئے ہے جو ''ترقی'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ قاہرہ کے کسی محلے میں، کسی نیم تاریک گلی میں، کسی بچے سے دریافت کریں، یا نیویارک سٹی کے کسی روشن ایونیو میں کسی جگ مگاتی خاتون سے یا چین میں کسی شاہ راہ پر چلنے والے ٹرک ڈرائیور سے۔ سب کا متفقہ جواب ہوگا کہ ہمیں ترقی تو کرنا ہی چاہیے کیونکہ بغیر ترقی کے تو ہم برباد ہو جائیں گے۔

آیئے، ذرا مصر کے ایک چھوٹے سے شہر دامن حور پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں جو اتفاق سے میرا آبائی شہر بھی ہے۔ عام رائے یہ ہے کہ اس چھوٹے سے شہر میں کچھ نہ کچھ ترقی ضرور ہوئی ہے۔ چاہے ٹیلی فون لائنوں کے استعمال کو لیجیے یا سڑکوں کی پیمائش، کاروں کی تعداد دیکھئے یا پروٹین کا استعمال، یا عام زندگی کی رفتار، سب سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ ترقی ضرور ہوئی ہے۔ لیکن پھر بھی! لیکن پھر بھی!! میرے بچپن میں بچے رنگ برنگی پتنگیں بنانے کے لئے باہر نکل جایا کرتے۔ بعد میں وہ ان پتنگوں کو نیلے آسمان کے پس منظر میں اڑایا کرتے۔ گھر کی عورتیں بچوں کے لئے پرانی جرابوں اور پرانے کپڑوں سے گیندیں تیار کرتیں۔ سارے بچے امیر اور غریب مل جل کر گیندیں کھیلتے اور پتنگیں اڑاتے۔ کھیل کے وہ لمحے، طبقاتی کشمکش اور سماجی نابرابری سے آزادی کے لمحات بھی تھے۔

Marfat.com

لیکن آج کل کھیل کود بھی طبقاتی کشمکش کو بڑھاوا دیتا ہے کیوں کہ غریب بچے تو اب بھی پرانے کپڑوں کی بنی ہوئی گیندوں سے کھیلتے ہیں یا پتنگ اڑاتے ہیں لیکن امیروں کے بچے فشر پرائس کمپنی (کھلونے بنانے والی ایک امریکی کمپنی) کے بنائے ہوئے کلدار کھلونوں سے کھیلتے ہیں جو بیٹری سے چلتے ہیں۔ امیر بچے کھیلتے بھی کیا ہیں بس حالتِ مفعولیت میں گڑیا گڈے بنے چپ چاپ ان کھلونوں کو چلتے دیکھتے رہتے ہیں جن میں سے بیشتر خودکار ہوتے ہیں۔ عمل کا مرکز بچوں سے ایک شے (کھلونے) کو منتقل ہوگیا ہے، اور انسان اس شے کا مجہول وصول کنندہ بن گیا ہے۔ ترقی کے نئے مدارج کے ساتھ ویڈیو گیمس کا رواج بھی ہوگیا ہے۔ انھیں فی الحال ترقی کا انتہائی نقطہ سمجھا جارہا ہے لیکن ان کے ذریعہ تنہائی اور بے گانگیت اس درجہ میں محسوس کی جارہی ہے جس کا اس سے قبل کبھی تصور بھی نہیں کیا گیا۔ انسان ایک معاشرتی حیوان کہا جاتا ہے۔ اسے دوسروں کی رفاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ان ویڈیو گیمس نے انسان کو اس کی انسانی سرشت کے ایک اہم پہلو سے محروم کردیا ہے۔

جب میں نوجوان تھا، اس وقت دامن حور میں تناؤ کی سطح کافی کم تھی۔ بیشتر لوگ دوپہر کے وقت کام کاج سے فارغ ہوجاتے تھے اور ان کے پاس اتنا وقت بچتا تھا کہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوسکیں۔ کیا فاضل وقت کی کمی، تناؤ میں زیادتی کی طرف اشارہ نہیں کرتی؟ یا اس کا اشاریہ صرف زمین، پانی اور ہوا میں بڑھتی ہوئی آلودگی ہے۔ شاید وہ شعور بھی اس کا اشاریہ ہے جو شب وروز کاریں پیدا کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ دامن حور کے سرسبز وشاداب پارک کیا ہوئے جہاں ہم موسیقی سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے اور جن کو اب سیمنٹ سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ مچھلیوں کا وہ پارک کیا ہوا جہاں سنہری مچھلیاں تیرا کرتی تھی، وہ میونسپل کلب کیا ہوا، جہاں اب ایک پٹرول اسٹیشن براجمان ہے۔ شہر کی شجر گاہ کیا ہوئی جہاں مختلف قسم کے نایاب پودے اپنی بہار دکھاتے تھے۔ ان سب کو ناگزیر ترقی کا دیو کھا گیا۔

Marfat.com

شام کو ہم سب گھروں کی چھتوں پر جمع ہو جاتے تھے، گیت گاتے تھے اور کہانیاں کہتے اور سنتے تھے۔ ہمارے پاس اتنا وقت ہوا کرتا تھا کہ تاروں بھرے آسمان کا نظارہ کر سکیں۔ اور ایک دوسرے سے گپ شپ کر سکیں۔ ان ہی محفلوں کے دوران ہم نے یہ جانا کہ ہمارے معاشرے کا وجود، یکجہتی اور ہم آہنگی پر ہے نہ کہ معاہدوں پر۔ رمضان کی شاموں مین ہم اخبار فروش محمد الاعور کے پاس جا بیٹھتے تھے جو سحر کے وقت ڈھولک بجا کر لوگوں کو سحری کے لئے جگانے کا کام بھی کیا کرتا تھا۔ جسے عربی میں المسحراتی کہتے ہیں۔ وہ طرح طرح کے لوک گیت گایا کرتا۔ ایک بار اس نے مجھے مدینہ منورہ کے اونٹ کی کہانی سنائی تھی جس نے قصاب سے بھاگ کر رسول اللہ ﷺ کے دامن عافیت میں پناہ لے لی تھی، آپ ﷺ نے اسے پناہ عطا فرمائی۔ اس وقت سے اونٹ کا تصور میرے تخیل میں بس گیا ہے، رمضان کے آخری عشرے میں الاعور رمضان کو وداع کرنے کے گیت گایا کرتا تھا۔ والدہ مرحومہ مجھے سحر کے وقت سے پہلے ہی اٹھا دیا کرتی تھیں کہ میں اس کے گیت سن سکوں۔ محمد الاعور سڑک کے کنارے اپنے رفیق کار کے ساتھ کھڑا ہوتا جس کے ہاتھ میں ایک لالٹین ہوتی۔ وہ اپنی مترنم آواز میں محلے والوں کے نام پکارتا جاتا۔ اپنا نام سن کر میں دوبارہ نیند کی وادی اور خوابوں کی دنیا میں چلا جاتا۔

کسی ایسے حقیقت پسند کو جو خواب دیکھنے، بغاوت کرنے اور حقیقت کو تبدیل کرنے کی ہر صلاحیت گنوا چکا ہے مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں ایک رومانیت پرست ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ دامن حور میں غریبوں اور مستضعفین کے لئے زندگی کیسا عذاب تھی لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ محض ماڈی ترقی انسانی دکھ کا درماں نہیں ہے (جیسا کہ بعض سادہ دل مادّیت پرستوں کا خیال ہے) میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دامن حور کوئی جنت نہ تھی لیکن ماضی اور حال کی بچکانہ یک جہتی یا مادّی حقیقت کے سامنے سپر انداز ہونے کے بجائے ہمیں ضرورت ہے کہ ہم ان معاملات کے بارے میں اجتہاد کریں تا کہ ترقی کے مغربی تصور کے زیریں علمیاتی مفروضے واضح ہو سکیں۔ تب ہی اس کا اندازہ ہو سکے گا کہ اس ترقی کی قیمت کیا ہے، اس کے فوائد کیا ہیں اور نقصانات کیا ہیں۔ اس کے لئے کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے۔

Marfat.com

ابتدائی نقطے کے طور پر، اس امر کا ادراک ضروری ہے کہ جدید مادی مغربی علمیاتی تناظر (Modern Materialist Western Epistemology) کا سنگ بنیاد مادی ترقی کا تصور ہے۔ یہ حوالے کا آخری نقطہ ہے۔ یہ مقصد وجود ہے اور ایسے فلسفیانہ سوالات کا جواب اسی میں پوشیدہ ہے، میں کون ہوں؟ یا اس کا مقصد خوب وزشت کے درمیان فرق کرنا ہے (انسانی نقطۂ نظر سے) یا اس کا مقصد پیداوار، صرف، خرید و فروخت کے لامتناہی سلسلے کو فروغ دیتا ہے یا محض انبساط کا حصول (Pursuit of pleasure) ہی اس کا آخری مقصد ہے۔ (مادّی نقطۂ نظر سے) ترقی کا مغربی تصور بلاشبہ ایک نقطۂ آغاز ہے۔ لیکن اس کے بعض اہم خصائص بھی ہیں جو درج ذیل ہیں:

1- جدید مغربی فلسفہ اور علمیات کے دوسرے تصورات کے مانند ترقی کا تصور بھی مادّہ وفطرت کے تصور پر منحصر ہے۔ فطری قوانین کی مانند ترقی بھی ایک ناگزیر عمل ہے، جو افراد کے ارادے کے علی الرغم ظہور پذیر ہوتا ہے اور اس کو کسی بھی طریقے سے روکا نہیں جا سکتا۔

2- ترقی ایک یک سطری عمل (Unilinear Procers) ہے جو بعض فطری قوانین کے تابع ہے۔ ان فطری قوانین کا اطلاق تمام معاشروں پر، مختلف اوقات اور زندگی کے ہر شعبہ میں یکساں طور پر ہوتا ہے۔

3- ترقی کے تصور کی ایک لازمی شرط یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی مشترکہ تاریخ کے بجائے ایک واحد تاریخ ہو جس کا اظہار مختلف تاریخی اور ثقافتی شکلوں میں ہوا ہو، اس کا نتیجہ یہ عقیدہ ہوگا کہ کسی خاص تاریخی اور ثقافتی تشکیل کے لئے جو کچھ "اچھا" ہے وہ ہر ثقافت اور ہر سماج کے لئے اچھا ہے۔ تاریخ کے اس نظریہ کو ہم "تاریخی وحدت الوجود" (Historical Pantheism) کہہ سکتے ہیں۔

4- یہ ممکن ہے کہ ترقی کا عمل متعدد ترقیاتی مرحلوں میں مکمل ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان مرحلوں کی

Marfat.com

تفاصیل میں فرق ہو لیکن بہ حیثیت مجموعی، ان کے مقاصد یکساں ہوتے ہیں اور ان کے نتائج بھی یکساں ہوتے ہیں۔

5- مغربی معاشرے، خاص طور پر مغربی یوروپ کے معاشرے اس ہمہ گیر ارتقائی، یک سطری فطری عمل کا نقطۂ عروج ہیں، اس لئے یہ معاشرے ایسی مثالی تشکیل بن گئے ہیں جن کا اتباع کیا جانا چاہیے۔

6- ترقی کا تصور اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ انسانی علم میں لامحدود اضافہ ممکن ہے۔

7- انسانی علم میں اضافہ کے ساتھ کائنات کی انسانی تسخیر میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

8- قدرتی ذرائع (پیداوار) محدود یا ناکافی نہیں ہیں۔

9- انسانی ذہن لامحدود اور بے پایاں ہے، اسی لئے لامحدود اور بے پایاں ترقی بھی ممکن اور ممکن الحصول ہے۔

تاہم، ترقی کے تصور کے بعض منفی اور تاریک تر پہلو بھی ہیں، ذیل میں ان میں سے چند کی طرف اشارے کئے جاتے ہیں:

1- کئی مفروضات جن پر مغرب کے مادّی ترقی کے تصور کی عمارت کھڑی ہے، ناقص اور غیر معتبر ثابت ہو چکے ہیں۔ مثلاً اب عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ قدرتی وسائل اور طبعی ذرائع پیداوار لامحدود ہونے کے بجائے محدود ہیں اور ایک دن ختم بھی ہو سکتے ہیں۔ (مثال: پٹرول اور کوئیلے کے ذخیرے جواب قریب الختم ہیں)، انسانی ذہن بھی محدود ہے۔ تیز رفتار، نقل پذیری اور حرکت پذیری، انسان کی نفسیاتی صحت کے لئے مضرت رساں ہو سکتے ہیں۔

2- انسانی نقطۂ نظر سے، نظریاتی سطح پر بھی ترقی کے تصور میں بہت سے سقم پائے جاتے ہیں۔ ''فطرت و مادّہ کی طرح ترقی کا عمل، کسی انسانی، یا روحانی پہلو سے محروم ہے۔ اس کا کوئی

Marfat.com

اخلاقی پہلو بھی نہیں ہے۔ آخر کار، ترقی محض ایک حرکت کا نام ہے، انسان اگر ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرتا ہے تو اس کا کوئی مقصد ہوتا ہے لیکن مغربی ترقی ایک بے مقصد عمل ہے۔ (یا ایک ایسا عمل ہے جس میں مادّی اشیاء کی پیداوار اور صرف کا مسلسل اور لامتناہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ نظریاتی سطح پر یہ لامتناہی سہی لیکن عملی سطح پر تو اس کے ڈانڈے دیوانگی سے جا ملتے ہیں)۔

3- یہ ہیجان انگیز اور بے مقصد حرکت نہ تو غیر جانب دار ہے اور نہ ہی معصوم۔ مادّہ پرستانہ فکر کے مطابق چونکہ انسان محض ایک فطری وجود ہے اس لئے اس کی فطری مادّی ضروریات بھی ہیں جن کی تسکین کے لئے ترقی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ ترقی بھی فطرت اور مادّے کی طرح روایتی نسلی، تہذیبی، مذہبی اور اخلاقی خصائص کی طرف غیر جانب دار ہے۔ اسی لئے ترقی کی تعریف مادّی منافع اور مادّی انبساط کے بیش ترین حصول کی حیثیت سے کی جاتی ہے تاکہ دوسرے مقاصد کا حصول اس کے دائرے سے باہر ہی رہے۔

یہی سبب ہے کہ ترقی کے بیش تر اشاریے مادّی زندگی کے حوالے سے مرتب کیے جاتے ہیں۔ مثلاً استعمال کی جانے والی ٹیلی فون لائنوں کی تعداد، کاروں کی تعداد، اور ان کی رفتار، سڑکوں کی لمبائی، اور انسانی نقل پذیری کا تواتر، (اگر انسان کی نقل پذیری زیادہ ہے تو اسے زیادہ ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے) یہ تمام معیار قابل پیمائش ہیں۔ وہ تمام اقدار جو پیمائش کے قابل نہیں ہیں یکسر رد کر دی جاتی ہیں۔

ترقی کے تصور جس کو فطرت کا ایک عام قانون سمجھا جاتا ہے اور مغرب کو اسی ترقی کا بامِ عروج ان دونوں خیالات کو تسلیم کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا زیریں مغرب کا علمیاتی اور فکری نظام افکار بھی برتر اور عام تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اس میں یہ اقرار بھی شامل ہے کہ مغرب تمام معاشروں کے لئے ایک

Marfat.com

قابل تقلید نمونہ ہے۔ مغربی انسان کی اقدار اور مقاصد جن کی جڑیں خاص تاریخی اور سماجی تجربہ میں پیوست ہیں، ساری دنیا کے لئے عام سمجھ لی جاتی ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مغربی نظریات کا اطلاق ہر طرح کی سماجیاتی تشکیل پر اس کی خاصیت (Specificities) پر دھیان دیئے بغیر کر دیا جاتا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر مغربی سماجیاتی و تاریخی تجربوں اور ان کی اہمیت کو قطعاً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

مغربی یوروپ اور شمالی امریکا کو چھوڑ کر باقی ساری دنیا اس ''غیر مغرب'' میں شامل سمجھی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ تمام غیر مغربی اقوام میں مغربی طرز کی ترقی کا ماڈل ہی مقبول ہو چلا ہے اور وہ اپنی قیمت آپ آنکنے کے لئے مغربی نظام افکار اور مغربی تصورات و افکار کا استعمال کرنے لگے ہیں۔ شمالی امریکا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور افریقہ کے کچھ حصوں کی دیسی آبادی کے قتل عام کے بعد یہ دوسرا تہذیبی قتل عام ہے جو مغربی تہذیب اور اقوام سرانجام دے رہی ہیں۔

ابھی حال ہی میں، میں نے ایک عرب ملک کی قومی ایئر لائن کے سربراہ کو ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ انفرادی حرکت کا تواتر، ترقی کی ایک علامت ہے۔ اس کے بعد اس نے ''ترقی یافتہ'' ممالک کی بین الاقوامی حرکت کی شرح کا حوالہ دیتے ہوئے کہا: ''انشاء اللہ ہم جلد ہی اس شرح کے قریب پہنچ جائیں گے''۔

دوسروں کے نظام افکار کے اس احمقانہ اور طوطے کی طرح نقالی پر ہی مغربی ٹکنالوجی کے استعمال کا دارومدار ہے۔ اس ''ترقی'' کی اصل قیمت کے بارے میں تو کوئی سوچتا ہی نہیں۔ حالانکہ اس ٹکنالوجی اور ان معاشروں کے نظام اقدار اور ثقافت کے درمیان گہرا رشتہ ہے۔ عموماً اس رشتہ پر لوگوں کی نگاہ نہیں جاتی اور اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس امر کا ادراک کیا جانا چاہیے کہ ٹکنالوجی صرف مشینوں اور آلات و اوزار کا نام نہیں ہے۔ یہ اس تخلیقی قوت کا نام بھی ہے جو انسانی ضروریات کی تکمیل

Marfat.com

کے لئے پیداوار کے طریقوں اور ذرائع پیداوار پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ مثلاً کُل قومی پیداوار (Gross National Product, GNP) کا تصور، اگر دنیا کے سارے ممالک میں نہ سہی تو بیشتر ممالک میں ضرور مستعمل ہے لیکن اس تصور میں ترقی کے ماڈی تصور کے تمام مضمرات، اپنے تمام سماجی، ماحولی، اخلاقی اور نفسیاتی عوامل کے خلاف تعصبات کے ساتھ موجود ہیں۔ اسی طرح ''معیار زندگی بلند کرنے'' ''قومی آمدنی میں اضافہ کرنے'' وغیرہ کے تصورات بھی مغربی ماڈی نظام افکار کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ''ترقی کی قیمت'' پر کچھ گفتگو کریں، ہمیں دھیان رکھنا چاہیے کہ جہاں تک ترقی کے ثمرات کا تعلق ہے وہ تو فوری، قابل احساس اور قابل پیمائش ہوتے ہیں لیکن اس کی قیمت دیر پا، اور نا قابل احساس (Imperceptible) ہوتی ہے۔ اس کی پیمائش بھی آسانی سے ممکن نہیں ہے۔ تاہم ترقی کی ''قیمت'' اس کے ثمرات کا جزء لاینفک ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ترقی کے اشاریوں میں وسعت پیدا کی جائے۔ اب ایک نظر ''ترقی'' سے پیدا ہونے والی ''برائیوں'' پر ڈالتے ہیں:

- بے مصرف اشیاء کی پیداوار جن سے ہمارے 'علم' میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، صرف ہمارا احساس بے گانگیت دوچند ہو جاتا ہے۔
- خاندانی زندگی کا بکھراؤ۔
- خاندانی بزرگوں اور بڑی عمر کے لوگوں کے ساتھ ہمارا برتاؤ۔
- خاندان کے ساتھ گذارے جانے والے وقت میں کمی۔
- کمپیوٹر اور دوسری اشیاء کے بڑھتے ہوئے استعمال کی وجہ سے براہِ راست انسانی رابطے اور ابلاغ میں کمی۔

Marfat.com

- نفسیاتی بیماریاں مثلاً ذہنی دباؤ، احساسِ افسردگی، مایوسی اور بے چارگی۔
- ترقی یافتہ ممالک میں بڑھتے ہوئے جرائم اور تشدد۔
- اسلحہ جات اور تباہی کے آلات واوزار پر بڑھتا ہوا خرچ (اس کی تاریخی نظیر ملنا مشکل ہے کہ فی زمانہ بنی نوع انسان کا خرچ ''ذرائع پیداوار'' سے کہیں زیادہ بربادی اور تباہی کے ذرائع پر ہے)۔
- کرۂ ارض کی اچانک (ایٹمی ہتھیاروں کے ذریعہ) تباہی یا رفتہ رفتہ تباہی (آلودگی کے ذریعہ) کے امکانات میں اضافہ۔
- سماجی بُنت (Social Fabric) ماحولیات اور تہذیبی ورثہ پر بڑھتی ہوئی سیاحت (Tourism) اور نقل پذیری کے اثرات۔
- حقیقت کا مکمل ادراک نہ کر پانے کا بڑھتا ہوا احساس (مابعد جدیدیت)۔
- بے گانگیت، اجنبیت، تنہائی اور لاتعلقی کے بڑھتے ہوئے احساسات۔
- دواؤں کی لت، منشیات کا استعمال۔
- شہوانیات اور فحشیات، اس کی پیداواری لاگت اور اس کے استعمال سے ہونے والے سماجی، اخلاقی اور انسانی نقصانات۔

چند لمحات کے لئے ہم ترقی کے ان منفی پہلوؤں پر بھی غور کرنا چاہتے ہیں، سب سے پہلے خاندانی زندگی کے بکھراؤ کو ہی لیجئے۔ اس بکھراؤ کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ خاندان کی طرف سے بچوں، خصوصاً نوزائیدہ بچوں کی دیکھ بھال میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس بکھراؤ کے سماج کے اوپر دوسرے خوفناک اثرات بھی ہوتے ہیں (مثلاً بچوں اور نوجوانوں میں نفسیاتی دباؤ، بے چینی اور تناؤ کے بڑھتے ہوئے رجحانات، اسکولوں میں گنڈہ گردی اور تشدد، جرائم نابالغاں، نفسیاتی علاج کی بڑھتی ہوئی ضرورت اور اس پر کیے جانے والے اخراجات وغیرہ)۔

Marfat.com

اس مرحلہ پر یہ تجویز بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ مسرت اور احساسِ تحفظ کو ترقی کے ثمرات کے اشاریوں میں شامل کیا جائے۔اس پر کھٹ سے یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ یہ اقدار، نسبتی (Relative) قابل تغیر (Changeable) اور موضوعی (Subjective) ہیں۔مزید برآں، یہ ناقابل پیائش بھی ہیں جب کہ ان کے برعکس ترقی کے ثمرات کی معروضی پیائش کی جاسکتی ہے! کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ترقی اور مسرت واحساس تحفظ دو الگ الگ چیزیں ہیں؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو پھر یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ آخر بنی نوع انسان کے لئے ترقی کی افادیت کیا ہے۔ماڈی ضروریات کی تسکین اور ماڈی اشیاء کے استعمال میں اضافہ! اس مرحلہ پر ترقی کے ماڈی تصور کی اصلیت بالکل نمایاں ہوگئی ہے کہ انسانی اشاریہ (مثلاً مسرت اور احساس تحفظ) اپنانے کے بجائے ماڈی اشیاء اور ماڈی زندگی سے متعلق اشاریہ (رفتار، پیداوار اور پیدا آوری وغیرہ) ترقی کے تصور میں شامل کیے گئے ہیں۔اس بات کی طرف چنداں توجہ نہیں دی گئی کہ اس ترقی سے انسان کے سُکھ میں اضافہ ہوتا ہے یا دُکھ میں۔

ماڈیاتی سطح پر بھی کچھ دشواریاں ہیں۔اس سلسلے میں ہم ایک نیا تصور استعمال کرنا چاہتے ہیں جس کے بنیادی خدوخال تو کئی مقالوں میں موجود ہیں لیکن شاید اس سے قبل اس کو کوئی نام نہیں دیا گیا، میں اس تصور کو ''کائناتی رجعت بنام صنعتی ترقی'' کہتا ہوں۔احیاء کے زمانے سے ہی مغربی انسان ترقی کی برکات گناتے رہے ہیں لیکن اس کے منفی پہلوؤں پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی جواب زیادہ نمایاں ہوتے جارہے ہیں۔ان منفی پہلوؤں میں سے ایک ماحولیات پر ماڈی ترقی اثرات ہیں۔یہ کائناتی رجعت کی ایک اچھی مثال ہے، یہاں کائناتی صفت کا استعمال اس لئے کیا گیا ہے کہ اس سے پورے کرۂ ارض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے نہ کہ کسی خاص جغرافیائی علاقے کی طرف۔اس طرح پوری نسل انسانی پر اس کے غلط اثرات پڑے ہیں نہ کہ کسی خاص قوم پر۔

اس طرح ''کائناتی رجعت'' اس نقصان کی طرف اشارہ کرتی ہے جو صنعتی ترقی کے باعث پورے کرۂ ارض کو ساری بنی نوع انسان کو اٹھانا پڑا ہے۔ملحوظ رہے کہ اس کی برکات سے تو صرف مغرب

Marfat.com

مستفید ہوتا ہے لیکن اس کے نقصانات میں ساری دنیا شریک ہوتی ہے۔ اس لئے ترقی کے کھاتے میں نفع اور نقصان دونوں درج کیے جانے چاہیے اور اس سے ہونے والے نقصانات مثلاً ماحولیاتی نقصان، اوزون کی سطح میں مسلسل کمی، آلودگی، نیوکلیائی فضلہ، کاربن ڈائی اکسائڈ کی سطح میں اضافہ اور اس سے پیدا ہونے والے سبز خانہ اثرات (Green House effects) وغیرہ نظر انداز نہیں کیے جانے چاہیے۔

نفع اور نقصان کا اندازہ لگانے میں اس منہج کا استعمال جراثیم کش دواؤں (Pesticide) کے سلسلے میں کیا جانے لگا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ زراعت میں جراثیم کش دواؤں کے استعمال کو ترقی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان دواؤں کے استعمال سے ہونے والا ماحولیاتی نقصان (کائناتی رجعت) ان کے فوری فائدوں سے کہیں زیادہ ہے۔ چنانچہ اقوام متحدہ کے ادارہ برائے غذا وزراعت نے (UN Food and Agriculture Organization, F.A.O) جو کبھی ان دواؤں کے استعمال کا بڑا پر جوش وکیل تھا، اب دواؤں کے استعمال کے خلاف مشورہ دینا شروع کر دیا ہے۔ اس طرح معاشی ترقی کی کھاتہ داری صرف اس کے مادی و معاشی فوائد گنوانے سے کبھی مکمل نہ ہوگی جب تک اس سے ہونے والے نقصانات اور منفی پہلوؤں کی نشاندہی بھی نہ کی جائے۔

2۔ نظریۂ ڈارون (یا نظریۂ نطشے)

ترقی کا مسلک، اپنا مادّی چہرہ بعض فقروں میں وا کرتا ہے جن کو جدید انسان کے نزدیک عقیدے کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے، مثلاً تنازع للبقاء، بقائے اصلح (Survival of Fittest) انسان اپنے بھائی کے لئے بھیڑیا ہے، اخلاق طاقتور کے خلاف کمزوروں کا ہتھیار ہے، یا طاقت کی قصیدہ خوانی اور طاقتور کو "فوق البشر" (Superman) قرار دینا وغیرہ۔ ان تمام فقروں میں موجود اقدار قطعی طور پر مادّیت کی نمائندگی کرتی ہیں جو ڈارون اور نطشے کے افکار میں اپنے عروج کو پہنچی۔

Marfat.com

یہ دونوں فلسفی بنی نوع انسان کی دنیا اور فطرت و مادّہ کی دنیا میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں کرتے بلکہ یہ اس پر زور دیتے ہیں کہ کشمکش اور تنازع للبقاء کی مادّی اور حیاتیاتی اقدار فطرت اور انسان پر یکساں طور پر حکمراں ہیں۔ جنگل اور انسانوں کی دنیا میں ایک ہی قانون رائج ہے۔ طاقت کا قانون، اس نظریہ کے مطابق طبیعاتی یا حیاتیاتی بقا ہی اس زمین پر انسانی وجود کا مقصد ہے۔ ارتقاء کا عمل، ایک گھمسان اور مستقل جدوجہد کے ذریعہ وجود پذیر ہوتا ہے۔ بنی نوع انسان اور فطرت دونوں پر طاقت کی حکمرانی ہے۔ اسی فلسفہ سے مغرب کا علمیاتی اور اخلاقی نظامِ افکار مستعار لیا گیا ہے۔

3- بازار- فیکٹری استعارہ

ڈارون اور نطشے کا یہی مادہ پرستانہ فلسفہ بازار- فیکٹری استعارہ میں جھلکتا ہے جو فطرت- مادّہ استعارے کے مماثل ہے، اس استعارہ کے نزدیک دنیا محض ایک بازار یا ایک کارخانہ ہے۔ اس نقطہ نظر کی جڑیں مادّہ پرستانہ وحدانیت (Matanalist Monism) میں پیوست ہیں۔ جہاں ہر شے کو محض مفید مادّہ کی حیثیت دی جاتی ہے۔ دنیا ایک مشین ہے اور انسانی وجود کا مقصد ہے کہ فطرت کی تسخیر کرے، اسے کام میں لائے۔ فطرت کی پیدا کردہ ہر شے خام مال کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسان اس لئے مفید ہیں کہ وہ پیداواری قوت رکھتے ہیں۔ اشیاء کی پیداوار اس لئے کی جاتی ہے کہ انھیں فروخت کے لئے بازار بھیجا جائے۔ بازار میں لوگ قوت خرید ہیں جو اشیاء کو خریدتے اور صرف میں لاتے ہیں۔ بازار اور پیداوار کا یہ نظام ایک ایسی معیاری دنیا کے مفروضے پر قائم ہے جس کے بارے میں تعین سے پیش قیاس کی جاسکتی ہے۔ اس دنیا میں ایسے انسان سرگرم عمل ہیں جن کا عمل بھی معیاری (Standardized) ہے اور جس کے بارے میں پیش قیاس کی جاسکتی ہے۔ دونوں ناقابل تبدیل فطری اور طبعی قوانین کے تابع ہیں۔ یہ معاشی انسان (Economic Man) پیداوار اس لئے کرتا ہے کہ صَرف کرے اور صَرف اس لئے کرتا ہے تاکہ مزید پیداوار کی جائے۔ اس عمل میں وہ صِرف اپنے مفاد کے تابع ہے۔ وہ دوسروں سے مسابقت کرتا ہے لیکن صِرف اپنے مفاد کے لئے اور اس سارے

Marfat.com

عمل میں کسی اخلاقی، یا علمیاتی یا روایت سے مکمل طور پر بے نیاز ہے۔ فطرت و مادّے کی طرح بازار فیکٹری بھی ایک بے رحم اور جامد اکائی ہے جو انسان کے تمام اخلاقی و روحانی اقدار سے بے نیاز مستقبل کی جانب رواں دواں ہے۔

4-مرکزی ریاست

ایک اہم تعصب جو مغربی علمیاتی فکری نظام سے جنم لیتا ہے، وہ مرکزی سیکولر قوم یا ریاست کے حق میں کیا جانے والا تعصب ہے۔ یہ تعصب عقلیت، ترقی، کنٹرول اور وحدتِ علوم جیسے تصورات سے بھی متعلق ہے۔ علوم کی وحدت اور ذہن کی معلومات کو جمع کرنے اور فطری قوانین کے تحت ان کی تشکیل نو کرنے کی صلاحیت کے پیش نظر یہ عقیدہ راسخ ہوا کہ سائنس کے ذریعہ معاشروں کی رہنمائی اور عقلی بنیادوں پر ان کی تشکیل و اصلاح ممکن ہے۔ مرکزی ریاست وہ اعلاترین ادارہ متصور کیا گیا جس کے ذریعہ ان مقاصد کا حصول ممکن کیا جانا تھا۔ یہ فرض کیا گیا کہ ریاست اپنے وسیع تر منصوبوں کے ذریعہ سماجی حقیقت کو وحدت میں پروئے گی، معیاری بنائے گی اور تمام نسلی اور لسانی افتراق کو ختم کر کے اس حقیقت کی ایسی تشکیل کرے گی جس کے ذریعہ مادی اور انسانی دائروں میں نظام افکار کے تمام مقاصد حاصل کئے جاسکیں۔ مادی دائرے میں بازار میں وحدت پیدا کی جائے، سڑکیں تعمیر کی جائیں۔ پیمائش کا نظام معیاری بنایا جائے۔ انسانی دائرے میں ایسی نوکر شاہی کو وجود میں لایا جائے جو انسانوں کو ہر چیز سے بلند ہو کر صرف ریاست کا شہری ہونے کی تربیت دے۔ تاکہ وہ ہر وفاداری سے بلند ہو جائیں۔ اس طرح ریاست کا شہری اسی فطری معاشی انسان کا ایک روپ ہو جو یک رخا ہونے کے ساتھ ساتھ مادّی نظام کا ایک جز بھی ہو۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ریاست بذات خود فطرت مادّہ اور مادّی وحدانیت کے فلسفہ سے جنم لیتی ہے۔ یہ بھی انسان اور فطرت کی ثنویت کو رد کر کے فطری مادیاتی وحدانیت کی طرف کوچ کرنے کی ایک کوشش ہے جو انسانی سماج کو اس کی بوقلمونی اور قوت سے محروم کر کے اسے ایک مہیب مشین میں

Marfat.com

تبدیل کر دیتی ہے جس کی ہر حرکت فطری قوانین کے تابع ہو اور اس کی آسانی سے پیش قیاسی کی جا سکے۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ ریاست خاندان اور مقامی گروہوں جیسی چھوٹی اکائیوں کے مقابلے میں بڑی اکائیوں کے ساتھ کام کرنا پسند کرتی ہے کیوں کہ نوکر شاہی نظام مخصوص اور بے نظیر اکائیوں کے ساتھ مناسب طور پر پیش نہیں آسکتا، یہ شہریوں کے ساتھ عام شہری کی حیثیت سے تو پیش آسکتا ہے جن کی عام ضروریات اور جانے مانے خواب ہوں لیکن یہ شہریوں سے ان کی نجی انفرادی شخصیت میں پیش نہیں آسکتا جن کی ضروریات خاص ہو اور جن کے خوابوں اور آرزوؤں کی پیش قیاسی مشکل ہو۔ چنانچہ ان کے اعمال میں اندروں کے مقابلہ میں بیرون کے حق میں تعصب پایا جاتا ہے، یہ نظام انسانی اتحاد کے بجائے معاہدانہ اتحاد اور نجی کے مقابلہ سرکاری کے حق میں بھی تعصب رکھتا ہے۔

5- بین الاقوامی صارف تہذیب (Consumer Culture)

مغربی مادّی نظام افکار کا سب سے خطرناک اور مہیب نتیجہ ایک ''بین الاقوامی مادی تہذیب'' کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ گو کہ اس تہذیب کا آغاز مغرب یا امریکا میں ہوا لیکن اس کی بیرونی شکل ان معنوں میں غیر جانب دار ہے کہ اس تہذیب کا کوئی مخصوص رنگ، مزاج یا کردار نہیں ہے، یہ نیم بین الاقوامی تہذیب بعض اشیاء سے پہچانی جا سکتی ہے جیسے ہمبرگر، ایک طرح کی معیاری غذا جو دنیا کے ہر حصے میں ایک ہی طریقے سے تیار کی جاتی ہے اور جس میں انسانی تخلیقیت کے اظہار کا کوئی امکان نہیں۔ یہ ایک ایسی غذا ہے جو انسان تنہا کھاتا ہے، وہ بھی شاید کھڑے یا چلتے ہوئے (جیسے ہزاروں برس پہلے کا فطری انسان اپنی غذا کھاتا تھا) اس تہذیب کی ایک پہچان نیلے رنگ کی جین (Bluejeans) بھی ہے، جو موٹے کپڑے کی پتلون ہوتی ہے۔ بہتر ہے کہ چیتھڑے لگی ہوئی ہو۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک عملی اور مفید پہناوا ہے کیونکہ اس کو تقریباً ہر موقع پر پہنا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ٹی شرٹ (T-Shirt) بھی چلتی ہے جس پر توجہ مبذول کرنے والا کوئی فقرہ لکھا ہو سکتا ہے۔ مثلاً کوئی اشتہار

Marfat.com

جیسے ''کوکا کولا'' پیجئے (Drink Coca Cola) یا شناخت ظاہر کرنے والا کوئی فقرہ جیسے ''مجھے قاہرہ پسند ہے'' (I Love Cairo) یا کوئی رجحان ''مجھے سنہرے بال والیاں پسند ہیں'' (I Love Blonds) یا کوئی سیاسی اعلان۔ ''جنگ نہیں محبت کیجئے'' (Make Love not Wars)۔ ان جملوں کی نوعیت سے قطع نظر یہاں مفروضہ یہ ہے کہ انسان بھی ایک جگہ ہے جو متحرک ہے اور جس کو اشتہار بازی کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس کی باہری شکل، اس کی اندرونی شکل کی غماز ہے۔ اور اس کی باہری سطح اور کھال بھی اس کے اندرون اور ضمیر کی طرح ہیں۔ ایک اور مثال ڈسکو میوزک کی بھی دی جاسکتی ہے۔ ان میں سے بیشتر اشیاء کا آغاز تو امریکا میں ہوا لیکن جلد ہی انھوں نے اپنی آزاد خود مختار اور حرکی شخصیت اختیار کر لی۔ ان میں فطرت و مادہ کے تمام خواص موجود ہیں جو انسان کے تخصص اور اندرونی شخصیت کو نظر انداز کر کے اسے عمومیت لاتعلق اور بے توجہی کا قیدی بنا دیتی ہے۔

اس تہذیب میں خطرہ یہ ہے کہ یہ انسانوں کی ایک بچکانہ خواہش کو درجۂ احترام عطا کرتی ہے کہ وہ اپنی شناخت کی ساری حدود کو پار کر جائیں اور اس سکھ دکھ بھری دنیا اور اخلاقی انتخابات سے اوپر اٹھ جائیں۔ اور ہمبرگر، ٹی شرٹ، کوکا کولا اور ڈسکو میوزک کی یک رنگی، اور یک سطحی دنیا میں داخل ہو جائیں، جہاں ان چیزوں کا زمان و مکان سے نہ کوئی رشتہ ہے اور جو تقریباً ہر تاریخی، اخلاقی اور انسانی مواد سے محروم ہیں۔ یہ صارف تہذیب (Consumer Culture) نہ صرف مشرقی تہذیب کے خلاف ہے۔ یہ مغربی تہذیب کے بھی خلاف ہے بلکہ یہ کسی بھی تہذیبی شکل کے خلاف ہے اسی لئے میں اس صارف تہذیب کو تہذیب دشمن (Anti Culture) کہنا زیادہ پسند کروں گا۔

Marfat.com

8

تعصب پر قابو پانے کے طریقے

تعصب کے مختلف طریقوں اور بالخصوص مغربی علمیاتی اور ثقافتی تعصب کا جائزہ لینے کے بعد ہم بعض ایسے طریقے تجویز کریں گے جن کے ذریعہ اس تعصب پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

1۔ تعصّب کی ناگزیریت کا اعتراف

ہم نے اس گفتگو کا آغاز تعصّب کی ناگزیریت کے دعوے سے کیا تھا۔ یہاں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس حقیقت (کہ تعصب ناگزیر ہے) کا ادراک واعتراف، اس مسئلہ کے حل کی طرف پہلا قدم ہے۔ کیونکہ اگر ہم کو تعصب کی موجودگی کا احساس ہوجائے تو ہم غیر جانب داری اور معروضیت کے بلند بانگ دعوں کے نام پر ''حقائق'' کو انفعالی طور پر قبول نہیں کریں گے۔ تعصب کی موجودگی سے انکار میں بذات خود ایک ماڈیاتی نقطۂ نظر کے حق میں تعصب موجود ہے جو انسانی ذہن اور انسانی وجود کو محض ایک فطری نظام کا جز، ایک غیر موثر، اور منفعل ذات قرار دیتا ہے۔ انسانی ذہن کا یہ سادہ تصور حقیقت کے ایک سادہ تصور سے تفاعل پذیر ہوتا ہے۔

تاہم یہ ایک غلط تاثر ہے۔ انسانی ذہن بے شک محدود ہے لیکن اس کی فعالیت میں شک نہیں۔ یہ ایک بے حد فعّال شے ہے جو حقیقت کا ادراک ایک منفعل اور موضوعی (Subjective) طریقے پر کرنے کے بجائے اس کا سامنا ایک پے چیدہ اور متنوع عنصر کی حیثیت سے کرتا ہے اور اس کے بعد تشکیل در تشکیل کے عمل میں مصروف ہوتا ہے۔ اس عمل کے دوران حقیقت کے بعض پہلوؤں کو بڑا کر کے دیکھا جاتا ہے جب کہ بعض دوسرے پہلوؤں کی تصغیر عمل میں آتی ہے یا ان کو غیر اہم بنا کر نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ اس عمل کے نتیجہ میں وہ علمیاتی نمونہ وجود میں آتا ہے جس کے ذریعہ انسانی ذہن کسی

Marfat.com

دنیاوی حقیقت یا عمل کا ادراک کرتا ہے۔ اس طرح ایک طرح سے انسانی ذہن بنی نوع انسان کو فطری قوانین کی بندش سے آزاد کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر دو انسانوں کا ایک ہی حقیقت کا ادراک ایک دوسرے سے جدا ہو سکتا ہے۔ اس میں ذاتی تجربہ کے علاوہ ثقافتی ورثہ، تاریخی یادداشت، علامتی نظام، جمالیاتی اور اخلاقی اقدار وغیرہ بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ ان سب اسباب کی بنا پر انفرادی اور اجتماعی تعصب ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس طرح تعصب کے وجود کا اعتراف کا مطلب ہے حقیقت اور ذہن کی سادگی کا انکار اور اس نظریہ کا بطلان کہ کچھ ایسے مجرد قوانین ہیں جن کے ثقافتی و سماجی پس منظر کا دھیان کئے بغیر تمام انسانوں اور فطرت پر اندھا دھند اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بچکانہ ماڈی فلسفوں کے خلاف بنی نوع انسان کی مرکزیت کا اعلان ہے۔ یہ بچکانہ فلسفے فطرت اور مادّے کی وحدانیت کے ساتھ ایک ایسی بے شکل کائنات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ جو اپنی بے شکلی میں شکل اختیار کرنے سے پہلے انسانی جنین کے مشابہ ہو۔

اب تک جو کچھ کہا گیا شائد اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ انسانی علوم، خواہ کتنے ہی معروضی (Objective) کیوں نہ ہوں، کسی نہ کسی حد تک بعض تعصبات کی عکاسی ضرور کرتے ہیں۔ سماجی علوم کے ماہرین بھی، خواہ کھلے دل سے یا بے دلی سے، اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ صرف چند علماء جو فطرت و مادّہ کے مجرد قوانین کے ماننے والے ہیں تعصب کی ناگریزیت سے انکار کرتے ہیں۔

مزید برآں، زیادہ تر لوگ تو طبیعات (Physics) کے قوانین کی فلسفیانہ تشکیل اور سائنسی تجربات کے نتائج کی تعبیر میں بھی تعصب کے دخل کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان فلسفیانہ تدوینیات کا استعمال سائنسی تجربات کی تعبیر میں کیا جاتا ہے جس کے بعد انہیں سائنسی قانون کا درجہ دیا جاتا ہے خواہ ان سائنسی تجربات اور ان قوانین کی فلسفیانہ تدوین میں کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ اگر ایک ماہر طبیعات (Physicist) اپنی تجربہ گاہ میں ایٹم کی حرکت کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس میں کوئی مانوس ترتیب

Marfat.com

(Familiar pattern) دریافت نہیں کر پاتا تو اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ ''کائنات بے ہنگم، منتشر اور غیر منظم ہے، اس کی حرکت صرف اتفاقی ہے''۔ اس کے برعکس وہ یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتا تھا کہ ''ذہن انسانی محدود ہے۔ اور کائنات کے تمام پہلوؤں کا مکمل ادراک کرنے سے قاصر ہے'' اپنے مادّہ پرستانہ اور ملحدانہ فکری نظام کے باعث مغربی سائنس عدم نظم، انتشار، لامقصدیت، اور اتفاق کے تصورات پر زیادہ زور دیتی ہے۔ اور یہی تصورات رائج ہو جاتے ہیں۔ گو کہ دوسرے بیان کی وضاحتی قوت زیادہ ہے۔ چونکہ پہلے بیان میں تخلیقی تفکیر اور اجتہاد کے دروازے چوپٹ کھلے ہوتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کو زیادہ ''سائنٹفک'' بھی سمجھا جانے لگا ہے۔ پہلے بیان کے برعکس دوسرے بیان میں یہ ادعا بھی نہیں پایا جاتا کہ ایٹم کی حرکات کا مشاہدہ کرنے کے لئے تمام ممکنہ تجربات عمل میں آ چکے ہیں یا یہ کہ اس کی پیمائش کے لئے تمام آلات تکمیل کی حد تک پہونچائے جا چکے ہیں۔

مغربی تجزیہ کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ بیشتر یہ تجزیہ، سیاسی، معاشی اور سماجی سطح پر کیا جاتا ہے۔ انسانی مکالمے کے زیریں علمیاتی نظام تک اس کی رسائی بہ مشکل ہی ہوتی ہے اس لئے یہ فلسفہ ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہے کہ ''ترقی کیا ہے؟'' یا اس ترقی کا انسانی پہلو کیا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ بحرانی صورت حال کے سوا یہ سوالات کم تر ہی اٹھائے جاتے ہیں۔ ان سوالات کے بجائے جو سوالات اٹھائے جاتے ہیں وہ یہ ہیں: ''ترقی کیسے ہوتی ہے، ترقی کا حصول کیوں کر ممکن ہے؟ ان سوالات میں ترقی کو مطلوب فرض کر لیا گیا ہے۔ اگر ہم اپنے علمیاتی تجزیہ کو اس کے منطقی انجام تک لے جائیں تو اس قسم کے سوالات اٹھانے پڑیں گے۔ ترقی کا مقصد کیا ہے؟ کوئی معاشرہ کس آدرش کے حصول کے لئے کوشاں ہے؟ کیا ترقی مادی، اور انسانی دونوں سطحوں پر قابل تشفی ہے یا صرف اس کا مادی پہلو ہی قابل توجہ ہے؟

ان سوالات کے اٹھاتے ہی ترقی کے مغربی تصور کے زیریں علمیاتی نظام کے تاریک پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔

Marfat.com

2- تنقید کامل

مغربی علمیاتی نظام میں تعصب دریافت کرنے کی کوششوں کو جزوی طور پر اختتام پذیر نہیں ہو جانا چاہیئے بلکہ ان کو مغرب کے پورے فلسفیانہ نظام کو اپنی گرفت میں لینا چاہیئے ورنہ ہم صرف پیوند کاری میں کامیاب ہونگے ،یعنی مغربی نظام افکار سے جہاں تہاں سے تصورات مستعار لے لئے اور ان کو ایک جگہ یا دوسری جگہ فٹ کر دیا گیا۔ کبھی کبھی اس کی یہ صورت بھی ہوتی ہے کہ مغربی تصورات بغیر کسی تبدیلی یا ان کے اخلاقی علمیاتی پہلوؤں میں معمولی تبدیلی کے ساتھ مستعار لے لیے جاتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہماری تہذیب میں بھی مغربی تہذیب کی طرح مساوی تصورات موجود ہیں۔

پیوند کاری کا یہ عمل یہ سمجھ کر انجام دیا جاتا ہے کہ موجودہ مغربی انداز نظر فطری، آفاقی اور حتمی ہے اس لئے اس کو مفید تر اور کام کا جو، بنانے کے لئے صرف اس کی ضرورت ہے کہ ذرا اس کی تزئین کاری کر دی جائے یا اس کے بعض تصورات میں ایک نئی ترتیب پیدا کر دی جائے۔ ایک زیادہ انقلابی ،پیچیدہ ،اور مکمل انداز نظر کا مفروضہ یہ ہوگا کہ تاریخ، تہذیب اور ثقافت کا کوئی ایک واحد راستہ نہیں ہے۔ بلکہ مختلف جہتوں پر مشتمل مختلف تاریخی اور تہذیبی راستے ہیں۔ ایسا تکثیریتی (Pluralistic) نقطۂ نظر اُسی وقت ممکن ہے جب مغرب کی تہذیبی تشکیل کا دوسری تہذیبوں کے ساتھ ملا کر اس کا مجموعی مطالعہ کیا جائے۔

3- مغربی علمیاتی نظام کی نارسائیوں کو آشکارا کرنا

مغربی علمیاتی نظام کی برتری کے احساس سے نجات پانے کی صرف ایک صورت ہے کہ اس کی نارسائیوں اور خامیوں کی اچھی طرح چھان پھٹک کی جائے اور ان کو آشکار کیا جائے۔ ذیل میں اس طرح کی ایک کوشش کی گئی ہے۔

Marfat.com

(الف) انسان دشمن نظام

یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ مغربی علمیاتی نظام میں انسان دشمن رجحانات موجود ہیں کیونکہ یہ نظام کائنات میں انسان کو کسی امتیازی حیثیت کا مالک یا انسانی ذہن کو بے پناہ تخلیقی قوت کا حامل قرار نہیں دیتا۔ یہ اس کائنات میں انسان کی مرکزیت کا بھی قائل نہیں۔ (اگر اسلامی استعارہ استعمال کیا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ مغربی فلسفہ انسان کو زمین پر اللہ کا خلیفہ نہیں مانتا) یہ مفروضہ، نہ صرف آزاد، اور ذمہ دار انسانوں کی حیثیت سے ہمارے تصورِ انسان کے خلاف ہے بلکہ یہ ہمارے وجودی تجربہ کے بھی برعکس ہے۔ یہ باور کرنا قدرے دشوار ہے کہ بالآخر انسانوں اور چیونٹیوں میں کوئی بڑا فرق نہیں۔ اور اگر تجزیہ کو اس کے منطقی انجام تک لے جایا جائے تو (جیسا کہ مادہ پرستوں کا خیال ہے) یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ انسانوں اور چیونٹیوں پر ایک ہی قانون لاگو ہوتا ہے۔ جب ہم یہ تسلیم کرلیں کہ مختلف حیاتیاتی جرثوموں کے درمیان کسی فرق، دوئی، یا سلسلۂ مدارج کا وجود نہیں تو ہم کو یہ بھی تسلیم کرلینا چاہئے کہ ہم اس دنیا کی مادّی تعبیر کو تسلیم کرتے ہیں جس میں عام، فطری، اور مجرّد کو خاص اور انسانی خاصیتوں پر فوقیت حاصل ہے۔

اس کے ساتھ ہی وہ تمام حد بندیاں زمین بوس ہوجاتی ہیں جنہوں نے انسان کا تشخص قائم کررکھا ہے۔ کہ وہ (انسان) خیر اور شر میں تمیز کا سلیقہ رکھتا ہے۔ مادّی واحدنیت، ایک ایسی بے چہرہ کائنات کے ساتھ جس کی کوئی سرحدیں نہ ہوں، اس کائنات کی پے چیدگیوں، سرحدوں، تکثیری سرحدوں، اور شناختوں کا سامنا نہیں کرسکتی۔ مختصراً یہ کہ وہ ان تمام خصائص اور امتیازات کا سامنا نہیں کرسکتی جو بنی نوع انسان کو دیگر ذی ارواح سے نہ صرف جدا کرتے ہیں بلکہ ممتاز بھی بناتے ہیں۔ مغرب کا مادّی علمیاتی نظام نہ صرف خدا کا منکر ہے بلکہ یہ بنی نوع انسان کے وجود کا بھی انکار کرتا ہے۔ خدا کی موت (نعوذ باللہ) جس کا مغرب نے کبھی بڑے فخر سے اعلان کیا تھا کہ درحقیقت بنی نوع انسان کی موت کا اعلان ہے۔

Marfat.com

(ب) مغربی ثقافتی اور علمیاتی نظام ناقابل عمل ہے

یہاں پر یہ توجہ دلانا بھی مناسب ہوگا کہ فطرت اور انسان کے بیچ کی خلیج پاٹنے کا مغربی منصوبہ تاکہ دونوں یکساں اور عام قوانین کے تابع ہوسکیں نہ صرف سطحی ہے بلکہ ناممکن بھی ہے۔ علمیاتی نقطہ نظر سے یہ نظام ذہن انسانی، اس حقیقت کے جس کا ادراک انسانی ذہن کرتا ہے، اس کی لسانی علامتوں کے اور ان دونوں کے درمیان تعلقات، کے سادہ اور آسان ہونے کے مفروضے قائم کرتا ہے۔ یہ نظام یہ بھی فرض کرتا ہے کہ علم کا تدریجی ارتقا اور اجتماع بالآخر لاعلمی کی بہ تدریج تخفیف کا باعث بنے گا اس طرح کہ لاعلمی کا دائرہ گھٹتا جائے گا اور علم کا دائرہ بڑھتا جائے گا۔ اور مزید یہ کہ جو کچھ ابھی بھی لاعلمی کے دائرے میں ہے اس کو بھی جانا جاسکتا ہے۔ ان تمام ابتدائی اور نوعیت کے لحاظ سے سادہ بیانات سے بزعم خود ایک نخوت آمیز نتیجہ برامد ہوتا ہے: کہ آئندہ (مستقبل کے کسی نقطہ پر) اس کائنات کے بارے میں بنی نوع انسان کا علم اور اس کے نتیجہ میں کائنات پر اس کا قابو، دونوں پایہ تکمیل کو پہونچ جائیں گے۔ اس نظریہ کو بچکانہ اور احمقانہ قرار دینا بھی ایک طرح کی فیاضی ہوگی۔ موجودہ زمانے اور اس کی نوعیت پر ایک سرسری نگاہ بھی ان تمام دعاوی اور اُن سے برآمد ہونے والے نتیجہ کو ڈھا دینے کے لئے کافی ہے۔

مغربی علمیاتی نظام عمومیت کی ایک ایسی سطح پر پہونچنے کا متمنی ہے جس کا علم کی موجودہ حالت کی بنا پر کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ''سماجی طبقہ'' (Social Class) کے تصور کو ہی لیجئے جس کی تعریف مارکس نے خالص مادّی بنیادوں، آمدنی، آلات پیداوار، اور تعلقاتِ پیداوار (Relations of Prduction) کی بنیاد پر کی۔ یہ تصور ایک سائنسی (علمی) تصور تک پہونچنے کی ایک کوشش ہے کہ یہ تصور غیر مبہم 'صحیح' آفاقی، عام اور مقدار کی پیمائش کرنے والا ہو، غرض وغایت سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کا انسانی فطرت سے کوئی علاقہ نہ ہو۔

Marfat.com

جس وقت مارکس اور اینگلز نے ''سماجی طبقات'' کا تصور دیا تو انہیں باقی دنیا کے بارے میں چنداں علم نہ تھا، مارکس کو تو مشرقی یوروپ مثلاً پولینڈ کے سیاسی اور سماجی ڈھانچے کے بارے میں بھی کوئی تفصیلی جانکاری نہ تھی۔ پھر بھی اس تصور کو اس طرح عام کیا گیا جیسے اس کا اطلاق، عام طور پر ممکن ہو۔ جب مارکس نے مشرق کے بارے میں مزید معلومات جمع کیں تو اسے احساس ہوا کہ مشرق میں بعض ایسے سماجی ڈھانچے موجود تھے جو ان ڈھانچوں سے مختلف تھے جن سے وہ مانوس تھا۔ اس کے بعد اس نے ہیگل کے ایجاد کردہ ایک فارمولے کا استعمال کرتے ہوئے چین، ہندوستان، ایران، جاپان، اور مصر وغیرہ کے پیداواری طریقوں (Mode of Prodcution) کو ''ایشیائی پیداوری طریقے'' (Asian Mode of Production) قرار دیا۔ یہ درجہ بندی اور تعریف اس قدر احمقانہ ہے جیسے یہ کہا جائے کہ ''میں مشرق کے بارے میں تو کچھ جانتا نہیں لیکن پھر بھی اس کے بارے میں چند باتیں میں ضرور کہوں گا'' ذرا خیال فرمایئے کہ اگر کوئی صاحب ان مارکسی اصولوں کی روشنی میں چین، ہندوستان، مصر اور جاپان کی طویل اور پے چیدہ تاریخ کا مطالعہ کرنے لگیں تو بھلا کیا حشر ہوگا۔ کیا ان کی عقل شریف میں کچھ آئے گا۔ اور کیا یہ تصورات کسی کام کے ہونگے۔ یا ان سے کوئی تجزیاتی یا وضاحتی کام لیا جا سکے گا؟

عملی سطح پر مغرب کے تہذیبی نظام کو جو وسائل کے کنٹرول، پیداوار اور صَرف کی زیادتی، اور مسلسل اور غیر محدود ترقی کے ستونوں پر قائم ہے ایک ''آسمانی دیوار'' (Cosmic Wall) کا سامنا ہے۔ اگر مغرب کے لوگ جو دنیا کی آبادی کا ایک قلیل حصہ (صرف 20%) ہیں اور وہ دنیا کے وسائل کا 80% استعمال کرتے ہیں تو یہ معاشی ترقی کا ایک ایسا نمونہ ہے جس کی نہ تو تقلید کی جا سکتی ہے اور نہ جس کو دوہرایا جا سکتا ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لئے مجھے ایک مثال دینے دیجئے۔ فرض کر لیجئے چین اور ہندوستان بھی ترقی کا یہی ماڈل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کا مطلب یقیناً یہ ہوگا کہ ان کا بڑھتا ہوا معیارِ زندگی پیداوار اور صَرف کی ہمیشہ بڑھتی ہوئی سطحوں سے عبارت ہوگا۔ ذرا خیال فرمایئے کہ اگر دنیا کی

Marfat.com

ایک تہائی آبادی ترقی کے بعد کاروں کا استعمال کرنے لگے تو اس کے لئے کتنی آکسیجن اور پٹرول خرچ ہوگا۔ اب اگر برازیل بھی اس دوڑ میں شامل ہو جائے تو کیا حشر ہوگا۔ خود اپنے قومی مفاد میں برازیل کے لئے مناسب ہوگا کہ وہ اپنے معیارِ زندگی پر روک لگائے تا کہ دنیا کے بارانی جنگلات کو جو دنیا کی کل آکسیجن کا ایک تہائی پیدا کرتے ہیں تباہی سے بچایا جاسکے۔ ورنہ ساری دنیا کی انسانی آبادی گھٹ کر جان دے دیگی۔

(ج) موجودہ مغربی تہذیب کے بحران کا مطالعہ

اب لازم ہے کہ ہم مغربی تہذیب اور مادہ پرست جدیدیت کے مغربی نظام کے بحران کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک عام نظریہ قائم کرنے کی کوشش کریں۔ مغرب نے اپنی ترقی کے ابتدائی مراحل میں حاصل ہونے والی ثقافتی اور مادی فتوحات اور کامیابیوں کے ذریعہ اپنی تشکیل کی ہے۔ اب ان فتوحات اور کامیابیوں پر ایک نظر ثانی کرنے کا وقت آگیا ہے۔ تاکہ اس کی خامیوں کو نمایاں کیا جاسکے۔ اب یہ کہا جاسکتا ہے کہ 1960 کی دہائی کے اواخر تک اس نظام کے تمام پہلو سامنے آچکے تھے۔ اب یہ صرف ایک نظریہ نہ تھا جس کا مقصد تبلیغ اور اپنے خیالات کو دوسروں تک پہونچانا ہو۔ اب یہ ایک ایسے ماڈی تہذیبی نظام کی شکل اختیار کر چکا ہے جس کے قصیر مدتی نتائج اور طویل مدتی خامیاں سامنے آچکی ہیں۔ بہت سے مغربی مفکرین نے اپنی ابتدائی امید پرستی سے توبہ کرلی ہے اور اب مغربی تہذیب اپنا ولولہ، اعتبار، اور خود اعتمادی کھو چکی ہے جو پہلی جنگ عظیم تک موجود تھا۔ اس کی مرکزیت اور آفاقیت فنا ہو چکی ہے۔ مغربی جدیدیت کے بحران (اور عظیم جنگیں اور عام تباہی کے ہتھیاروں کا ڈھیر، ماحولیاتی بحران، اور مغربی انسان کی اپنے آپ اور اپنے ماحول سے بڑھتی ہوئی بے گانگیت اور بے زاری کے پیش نظر) یہی ہونا تھا اب تک ان مسائل کا تذکرہ صرف شاعری، ناولوں اور سنجیدہ مقالات تک محدود تھا۔ لیکن 1960 کے بعد تو یہ موضوعات ذرائع ابلاغ کے ذریعہ روزمرہ کے مباحث میں شامل ہو گئے ہیں۔

Marfat.com

مغربی دنیا کا بحران، ہمارا خیالی کارنامہ نہیں ہے۔ نہ ہی تیسری دنیا کا کوئی انقلابی اقدام ہے۔ یہ تو ایسا موضوع ہے جو اسپنگلر اور ٹوائن بی جیسے اہم مغربی مفکرین کی نگارشات میں موجود ہے۔ اس بحران کا مشاہدہ علم کی تمام شاخوں میں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ اور تحلیل ضروری ہے تاکہ ہم اس بحران کی نوعیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ سکیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل سوالات اٹھانا ضروری ہے:

- کیا فحشیات کے فروغ، (انسانی تقدیس کی خلاف ورزی) ماحول کی آلودگی اور عام تباہی کے ہتھیار جمع کرنے کے رجحان (تقدیس کائنات کی خلاف ورزی) میں کوئی علاقہ موجود ہے؟

- کیا مادہ پرستانہ عقلیت (Materialist Rationalism) اور بعض نسلوں کی عام تباہی (Holocaust) کے درمیان کوئی علاقہ موجود ہے۔ ملحوظ رہے کہ ہولوکاسٹ کی عام تباہی کی بنیاد بنی نوع انسان پر مادّی افادیت کے اصول کا اطلاق ہے۔ (نازی یہودیوں کو "بے فائدہ مخلوق"، قرار دیتے تھے) چنانچہ بے فائدہ مخلوق کو اس طرح فنا کئے جانے کا جواز ہے جس طرح بے فائدہ مادّہ سے نجات حاصل کی جاتی ہے۔

- کیا اس بحران سے نجات حاصل کرنے کا کوئی راستہ ہے۔ یا موجودہ مغربی تہذیب کی مادّہ پرستانہ افادیت پرستی کی روشنی میں یہ تاریخی طور پر ناگزیر ہے؟

(د) بے راہ روی کا فلسفہ

مغربی علمیاتی نظام کی ماہیت اور اس کے بحران کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں اس کے مختلف مظاہر کی تفتیش کرنا چاہئے۔ ہم پہلے اس عمل پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں جس کو "مغربی تہذیب کی بے راہ روی" قرار دیا گیا ہے۔ یہ مغربی تہذیب کے بعض منفی پہلو ہیں لیکن مغربی تہذیب کے مورخین ان کو محض "بے راہ روی" قرار دیتے ہیں۔ اس بے اعتادی کے دو مظاہر مغربی یورپ میں "نازی ازم" و "فاشزم" اور "صہیونیت" کا ظہور ہے۔

Marfat.com

تعصب پر قابو حاصل کرنے کا سب سے موثر طریقہ ان بے راہ رویوں کے تحت کارفرما نظاموں کا مطالعہ ہے، فی الحقیقت بے راہ روی کی مثالیں موجودہ مغربی تہذیب کی استثنائی مثالیں ہونے کے بجائے اس نظام کا ناگزیر حصہ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ نام نہاد بے راہ روی دراصل مغربی تہذیبی نظام کی اندرونی منطق سے ہم آہنگ ہے۔

اس نظام کی اصل فطرت دریافت کرنے کا ایک موثر طریقہ یہ ہے کہ مغربی استعماریت کے تحت نظام کا تحلیلی مطالعہ کیا جائے۔ اس قسم کے کسی مطالعہ کو مندرجہ ذیل معاملات کو سلجھانا ہوگا۔

کیا یہ ممکن ہے کہ مغرب کی خوش حالی اور معاشی ترقی کو اس کے استعماری نظام سے الگ کر کے دیکھا جا سکے جس نے وہ صرف یہ کہ دنیا کو تقسیم بلکہ اسے برباد کر کے رکھ دیا۔ استعماریت کی یہ غارت گری، اپنے پیمانے اور نوعیت دونوں لحاظ سے دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ وہ ساری دولت، جو استعماری عہد میں برطانیہ نے ہندوستان سے لوٹی، خود برطانیہ کی صنعتی انقلاب کے زمانے کی کل پیداوار سے بھی زیادہ تھی۔ برطانیہ عظمیٰ نے نو آبادیاتی عہد میں اپنی نو آبادیات سے صرف اقتصادی فائدے ہی نہیں اٹھائے اس نے اپنے سماجی مسائل بھی ان کے سر تھوپ دیئے۔ جن میں فاضل انسانوں کا اخراج، (بے روزگاروں کی برآمد)، ناپسندیدہ مذہبی اور نسلی اقلیتوں کا اخراج (مثلاً یہودی) ان مجرمین کا اخراج جن سے سماج کو خطرات لاحق تھے، اور ان تمام افراد کا اخراج، جو سماجی حرکت پذیری (Social Mobility) کے عمل میں ناکام ہو گئے ہوں۔ یہ تمام افراد اشیاء کی ایک بڑی مقدار کے ساتھ مشرق میں دھکیل دیئے گئے۔ مزید براں نو آبادیاتی قوتوں نے غلام ممالک کے وسائل، افرادی قوت، تکنیکی مہارت، کچے مال، پر قبضہ جمایا، یہاں کے نوادرات لوٹ کر لے گئے۔ اس میں اٹھارویں صدی کے اواخر (انگلینڈ میں صنعتی انقلاب کی ابتدا) سے بیسویں صدی کے وسط (تیسری دنیا میں صنعتی انقلاب کی ابتدا) کے درمیان تک جلائی گئی آکسیجن اور فضا میں بڑھائی گئی کاربن مونو آکسائڈ کا حساب لگا دیا جائے تو اس غارت گری کی تصویر مکمل ہو جاتی ہے۔ استعماری نظام نے تیسری دنیا کے قدرتی وسائل میں تخفیف کی۔ ان وسائل کے زوال سے تیسری دنیا کی ترقی کرنے کی صلاحیت متاثر ہوئی کہ اس زمانے میں جب قدرتی

Marfat.com

وسائل کے محدود ہونے اور ماحولیات کی آلودگی کا احساس بڑھتا جا رہا ہے وہ اپنے ممالک کو ترقی نہیں دے سکتے۔ ان تمام حقائق کے پیش نظر یہ کہنا کیسے ممکن ہے کہ سرمایہ دارانہ ارتکاز (Capitalist Accumlation) کا عمل، استعماری ارتکاز سے الگ اور مختلف ہے۔ فی الحقیقت استعماریت کو نظر انداز کرنے سے مغربی ثقافتی اور علمیاتی نظام کے مطالعہ میں تعصب کا ایک ایسا عنصر پیدا ہو جاتا ہے جو ایک بنیادی تحلیلی غلطی ہے اور جس سے احتراز کرنا بہتر ہے۔ اس لئے مغربی تہذیب، مغربی سماج اور مغربی جدیدیت کے مطالعہ میں ایک تحلیلی تصور کی حیثیت سے استعماریت کا شامل جانا ضروری ہے۔

تاہم یہ تسلیم کیا جانا چاہئے کہ مغربی اور (انسانی) تہذیب کی تاریخ میں نازیت (Nazim) کا عروج ایک نازک لمحہ تھا۔ اس اعتبار سے بھی یہ تاریخ میں بے نظیر اور لاثانی ہے کہ اس سے قبل کبھی لاکھوں انسانوں کو بہ یک وقت سوچے سمجھے عقلی منصوبہ کے تحت موت کے گھاٹ نہیں اتار گیا۔ تاہم اس نازک لمحہ کو ایک اہم مرحلہ قرار دیا جا سکتا ہے جب مغربی تہذیب نے اپنا تاریک تر چہرہ بے نقاب کیا۔ اگر نازی ازم کو نسلی امتیاز کے مقابل دیکھا جائے تو یہ زیادہ واضح ہو جائے گا۔ نسلی امتیاز کا چلن انیسویں صدی کے نصف آخر میں خاص طور پر دیکھا گیا اور یہ مغربی استعماریت کی نظریاتی بنیاد بن گیا۔ دوسرا رجحان جس سے نازی ازم کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے وہ دیسی امریکیوں کا قتل عام اور افریقی بھائیوں کی غلامی ہے۔ ان دونوں موازنوں سے یہ واضح ہو جائے گا کہ نازی ازم کو محض مغربی تہذیب کی ''بے راہ روی'' قرار دینا مناسب نہیں ہے۔ درحقیقت نازیت مغربی تہذیب کی بے راہ روی نہیں بلکہ ایک ناگزیر لمحہ تھا جو دوسری تہذیبوں سے ذرا بھی مختلف نہیں تھا۔

(ہ) مغرب سے اختلاف رائے کی آوازیں

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مغربی تہذیب رفتہ رفتہ اپنے بحرانوں کے وجود سے واقف ہو گئی ہے۔ اس کی خود اعتمادی میں کچھ کمی آئی ہے اور اس نے اپنے مفروضات اور بنیادی دعاوی کی صحت کے بارے میں سوال اٹھانے شروع کر دیئے ہیں یہاں تک کہ بعض مغربی دانش وروں نے بھی ان

Marfat.com

مفروضات اور خود مغربی تہذیب کے بحرانوں کا تجزیہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ بعض دانش وروں نے اِن بحرانوں سے نکلنے کی تجاویز بھی پیش کردی ہیں جن میں سے بعض تجاویز تو خاصی انقلابی ہیں اور بعض قدرے معتدل یا قدامت پرست بھی ہیں۔ ان برگشتہ دانش وروں نے مغربی تہذیب کے بعض متبادل تناظر پیش کئے ہیں اور ان کا تعلق علوم کے مختلف شعبوں مثلاً ادبی تنقید، لسانیات، فلسفہ، ماحولیات، طبعی علوم، تاریخ، اور سماجیات وغیرہ سے ہے۔ ان تحریروں کے جائزے سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ برگشتہ دانش ور مغربی تہذیب کے دعووں کو تسلیم نہیں کرتے۔ جب یہ تحریریں، عربی اور دوسری ایشیائی زبانوں میں منتقل ہو جائیں گی تو مغربی ثقافت کی ایک بامعنی تنقید اور مغرب کے ساتھ مثبت گفت وشنید کا دروازہ کھل جائے گا۔

(i) جدیدیت

مغربی دانش وروں کی جدیدیت کے بحرانوں، اس کی انسان دشمنی، اور عدمیت (Nihilism) کے بارے میں نئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ بعض فلسفیانہ اور ادبی جرائد میں جن میں سے کچھ عیسائیت کی طرف رجحان رکھنے والے بھی ہیں۔ کئی قیمتی مقالے، ان موضوعات پر شائع ہو چکے ہیں۔ لوکاکس (Lukacs)، فریڈرک جیمسن (Fredrik Jameson)، اور ٹیری ایگلٹن (Terry Eagleton) وغیرہ نے مارکسی نقطۂ نظر سے جدیدیت کی سخت تنقید کی ہے۔ اپنے عدمیت کے نقطۂ نظر کے باوجود، مابعد جدیدیت (Post Modernity) فکر نے مغربی جدیدیت اور اور روشن خیالی کے بعض پہلوؤں کی سخت تنقید کی ہے۔

(ii) نظریہ ترقی

ترقی کے جدید مغربی تصور کے بارے میں کئی نظریات پیش کئے گئے ہیں جن میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ کمیاتی (quantitative) اور مادّیاتی تصور ہے جو بنی نوع انسان کے انسانی کردار اور کیفیاتی خصائص (Qualitative attributes) پر کماحقہٗ دھیان نہیں دیتا۔ ماحولیاتی بحران کے

Marfat.com

شدت اختیار کرنے کے ساتھ ہی مختلف دانشوروں نے یہ سوال اٹھانا شروع کر دیا ہے کہ مغربی طرز ترقی اور معاشی نمو کی حدود کیا ہیں؟ تیسری دنیا کے کئی ممالک میں مغربی طرز کے ترقیاتی مشروعات کی ناکامی نے بعض ایسی تحقیقات کو جنم دیا ہے جن میں ترقی اور نمو کے بنیادی اور مرکزی تصورات کے بارے میں سوالات اٹھائے گئے ہیں۔

(iii) ''سبز'' پارٹیاں اور ماحولیاتی کارکن

مغرب میں ''سبز پارٹیوں'' (Green Parties) اور ماحولیاتی کارکنوں (Environmental Activists) کا عروج مغربی ثقافت کے مقابل متبادل ثقافت کے حق میں ہونے والی سب سے اہم تبدیلی ہے مغرب کی ماڈی فکر اس مفروضہ پر قائم ہے کہ ذہن انسانی بے پایاں اور لامحدود ہے۔ اور کائنات پر فتح حاصل کرنے اور اسے کنٹرول کرنے کی اس کی صلاحیت بھی لامحدود ہے۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ قدرتی وسائل بھی لامحدود اور کبھی نہ ختم ہونے والے ہیں۔ دوسری جانب ماحولیاتی عاملوں اور کارکنان کا خیال ہے کہ ذہن انسانی اور قدرتی وسائل دونوں محدود ہیں۔ اس لئے خود انسان کے حق میں بہتر ہے کہ وہ ان وسائل کے استعمال میں احتیاط اور توازن سے کام لے اور قدرت کو ناقابل تلافی نقصان نہ پہونچائے۔ ان کی فکر کے زیریں نظریات مغرب میں مروجہ ماڈی تصورات ونظریات سے بہت مختلف ہیں۔

(iv) مغربی تاریخ کا انحرافی نظریہ (Revisionist View of Western History)

مغربی تاریخی فکر کا انحرافی تصور رکھنے والی کئی تحقیقات بھی سامنے آئی ہیں مثلاً استعماریت کی تاریخ ان مظلوم قوموں کے نقطہ نظر سے دوبارہ کی گئی ہے جن کے تاریخی ورثہ کو برباد کر دیا گیا، جن کا طرز ندگی تباہ کر دیا گیا اور جن کے قدرتی وسائل لوٹ لئے گئے۔ ان میں سے کچھ اقوام کی تو بڑے پیمانہ پر نسل کشی کی گئی۔ ایک دوسری مثال فرانسیسی انقلاب کی ہے۔ اس انقلاب کے دوسو سالہ جشن کے موقع پر انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بیسیوں ایسی کتابیں شائع ہوئیں جن میں اس انقلاب کے مرکزی تصورات اور مغربی تاریخ میں اس کی مرکزیت اور ناگزیریت پر نظر ثانی کی گئی اور اس ضمن میں نئے

Marfat.com

نظریات پیش کیے گئے۔ کچھ کتابوں نے مارچ 1793 میں ہونے والی ونڈی کی جنگ (Battle of Vendee) پر تنقیدی نظر ڈالی جس میں موجودہ تاریخ میں پہلی بار منظم طریقے پر کسی آبادی کا قتل عام کیا گیا تھا۔ اس جنگ میں فرانسیسی انقلاب کی افواج نے بوڑھوں، بچوں اور جوانوں اور عورتوں کو "انقلاب دشمن" قرار دے کر تہ تیغ کر دیا تھا۔

ایک کتاب میں یہ واضح کیا گیا کہ فرانسیسی انقلاب کے دوران کیا جانے والا تشدد اور دہشت انگیزی "وقتی اور عارضی بے راہ روی" ہونے کے بجائے اس انقلاب کی بنیادی فکر کے ترجمان تھے۔ اس کتاب میں اس نظریہ کی حمایت کی گئی کہ مذہب کی گرفت سے نجات حاصل کر لینے کے بعد حکمرانوں کے پاس تشدد ہی ایک ایسا واحد ہتھیار رہ گیا تھا جس کے ذریعہ وہ عوام کو اپنی جانب متوجہ کر سکتے تھے اور نئی ریاست کے حق میں ان کی خدمات حاصل کر سکتے تھے۔

کچھ دوسری کتابوں میں نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے تئیں انقلاب فرانس کے رویہ کا جائزہ لیا گیا اور یہ دکھایا گیا کہ ان کی امتیازی خصوصیات مٹا کر کس طرح ان اقلیتوں کا واقعتاً یا استعارۃً خاتمہ کیا گیا۔ ایک اور کتاب اس موضوع پر لکھی گئی کہ انقلاب فرانس نے معاشی ترقی کی رفتار دھیمی کر دی اور اس طرح انگلینڈ کو اس بات کا موقع دیا کہ وہ معاشی نمو کی دوڑ میں فرانس سے آگے نکل جائے۔ بعض دوسری کتابوں میں انقلاب فرانس کے ان سماجی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے جن کی طرف "روشن خیال" مصنف توجہ دینا بھی مناسب نہیں سمجھتے مثلاً یہ کہ انقلاب فرانس کے بعد شرح طلاق میں اضافہ ہو گیا اور فرانس میں ناجائز بچوں کی شرح پیدائش بھی بڑھ گئی۔

(۷) طبعی علوم کے فلسفیانہ نظام میں ہونے والی بنیادی تبدیلیاں

جن علوم میں متبادل فکر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوئی ہے وہ طبعی علوم کا فلسفیانہ نظام ہے۔ انیسویں صدی کی سائنس کا انحصار ذہن اور علم کے ایک غیر تخلیقی اور جامد تصور پر تھا۔ یہ اس عقیدے پر قائم تھی کہ رفتہ رفتہ بہ تدریج ترقی کے ساتھ علم میں اضافہ ہوتا جائے گا اور نامعلوم کا دائرہ گھٹتا

Marfat.com

جائے گا یہاں تک کہ نا معلوم کا دائرہ معدوم ہو جائے گا۔ مکمل علم حاصل ہو جائے گا اور اس طرح کائنات پر انسان کی تسخیر مکمل ہو جائے گی۔

لیکن یہ سب کچھ ایک سراب ثابت ہوا۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ علم میں ترقی کے ساتھ ساتھ، نظریات، تجربات، نتائج، اور مشاہدات اور اعداد و شمار میں اتنی بڑی مقدار میں اضافہ ہوا ہے کہ کسی ایک فرد کے لئے ان سب متضاد معلومات کا انجذاب، اور ادراک تقریباً ناممکن ہے۔ اس طرح یہ خیال کہ نا معلوم بہ تدریج معدوم ہو جائے گا اور معلوم کی نا معلوم پر فتح ہو گی اب مکمل طور پر خام خیالی ثابت ہو چکا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علم کے دائرہ میں اضافہ ہوا ہے لیکن نا معلوم کے دائرہ میں اضافہ اس سے کہیں زیادہ تیز رفتار ہے۔ جتنا زیادہ ہم جانتے ہیں ہم یہ جانتے جاتے ہیں کہ ہم کتنا نہیں جانتے۔ یہ احساس اب سائنس کے نظریات، تصورات، اور سائنسی قوانین تک میں اجاگر ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بنی نوع انسان نے اپنے ذہن کی محدود صلاحیت کو جان لیا ہے۔ طبعی علوم نے تعلیل کے سخت قانون کو تج دیا ہے اور اس کی جگہ ارتباط (Correlation) کو اپنا لیا ہے۔ اب یہ علوم حقیقت کے مکمل ادراک کے بجائے اس کے جزوی ادراک پر بھی اکتفا کرتے ہیں۔ اس نتیجہ پر قدرے زور دینے کی ضرورت ہے تا کہ محققین اور علماء مادّہ پرستانہ قانون تعلیل کی گرفت سے آزاد ہو سکیں۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اب مغربی علماء اور مفکرین کی ایک بڑی تعداد نظریاتی سطح پر تکثریت (Plurality) کی قائل ہو گئی ہے۔ تاہم مادّی عقلیت پر مبنی تناظر اب بھی بین الاقوامی اداروں جیسے عالمی بینک، اقوام متحدہ، اور پنٹاگن وغیرہ کا بنیادی تناظر ہے۔

مغرب کی نسبتی اہمیت

اس تنقید کا مقصد مغربی نظام کی کمزرویوں کو آشکارا کرنا یا اسے تباہ کرنا نہیں ہے (گو کہ عدمیت اور مابعد جدیدیت اسی سلوک کے حقدار ہیں) اس کے علی الرغم، ہمارا مقصد یہ ہے کہ مغربی علوم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے، ایک وہ حصہ ہے جو مغربی تہذیب کا جزء ولاینفک ہے اور دوسرا وہ حصہ جو

Marfat.com

آفاقی ہے اور انسانی ورثہ کا جزء ہے۔ آفاقی حصہ اس قابل ہے کہ اسے مضبوط تاریخی حقیقت کے طور پر قبول کیا جائے اور آزادانہ نظریاتی مسلمات میں شامل کیا جائے۔

اس مقصد کے حصول کی خاطر ہم کو اس احساس سے نجات حاصل کرنا ہوگی کہ مغرب، یا اس کی ذہنی کاوشیں اور اس کے مسلمات مرکزی، آفاقی اور مطلق ہیں۔ اسی طرح ہم کو یہ تسلیم کرنا ہوگا جن ''سائنسی قوانین'' کی تبلیغ مغرب کرتا رہا ہے وہ ایک خاص تاریخی اور ثقافتی صورت حال کی پیداوار ہیں۔ ان میں ایک خاص تاریخی لمحہ کے عوامل اور عناصر کا امتزاج ہے۔ ایک بار اس حقیقت کا ادراک کر لیا جائے تو مغرب کی نسبتی اہمیت اجاگر ہو جائے گی۔ مغرب بھی دوسری تہذیبوں کی طرح ایک تہذیبی تشکیل بن جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں اس کی آفاقیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ تاہم اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم مغرب کے علمی خزانے سے ایک واقعتاً آفاقی اور تقابلی تناظر برآمد کر سکیں۔ جس میں مغرب کی تہذیبی تشکیل کے تاریخی عناصر پر زور دیا گیا ہو بالکل اُسی طرح جس طرح دوسری تہذیبی تشکیلوں کے اپنے نمایاں اور مخصوص اوصاف ہیں۔

تقابلی تناظر کا مطلب یہ ہے کہ ایک تہذیبی تشکیل دوسری تہذیبی تشکیل سے کس طرح اثر پذیر ہوئی (عالم عرب کے علمی حلقوں میں یہ رویہ عام ہے) اس کا مطلب ہے کہ تمام انسانی معاشروں کے رنگا رنگ اور مختلف تجربوں کی بنیاد پر ایک حقیقی آفاقی تناظر کو دریافت کرنے کی کوشش کرنا۔ چنانچہ اس کے لئے مختلف تاریخی تجربات اور عملیاتی تناظر کا گہرا تجزیہ ضروری ہے جس میں انسانوں نے اپنے اردگرد کی دنیا سے تعامل کے ذریعہ مختلف تہذیبی تشکیلوں کی صورت گری کی ہو، جس کے تخصص سے ان کے انسانی پہلو اجاگر ہوتے ہوں، نہ کہ کسی مفروضہ ''عام قوانین'' سے تطابق آفاقی تناظر کی راہ اس لئے اور بھی آسانی ہوگئی ہے کہ مغربی تہذیب اپنی مفروضہ مرکزیت کھو چکی ہے۔ اور اب مغربی معیاروں سے بھی غیر مغربی تہذیبی مراکز کے عروج کو تسلیم نہ کرنا آسان نہیں رہا۔ مغربی تہذیب کی نسبتی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے مندرجہ ذیل مسائل کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔

Marfat.com

1- مغربی تہذیب کے نمایاں خصائص کا ادراک

مشہور جرمن عالم سماجیات میکس ویبر (Max Weber) نے اپنی تحریروں میں سماجی عمل کے مختلف مظاہر سے بحث کی ہے۔ لیکن شائد اس کا سب سے اہم کارنامہ مغربی تہذیب کے نمایاں خصائص کی نشان دہی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس خصوصیت کا سب سے بڑا مظہر، عقلیت کا تدریجی اور اضافہ پذیر رجحان ہے۔ یہ عمل اتنا ہمہ گیر ہے کہ بالآخر یہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہو گیا ہے۔ عقلیت کا یہ عمل بعض ایسے عناصر کے باہمی تفاعل کا نتیجہ ہے جو خاص طور پر مغربی تہذیب سے وابستہ رہے ہیں مثلاً: رومن قانون، مغرب کے شہروں کی بناوٹ، یہودی عیسائی روایت کے بعض پہلو، یہاں تک کہ موسیقی کا ارتقا بھی۔ میکس ویبر کے خیال میں، یہ عقلیت کا رجحان ہی ہے جو اس عمل کے عروج کے لئے ذمہ دار ہے جس کو وہ "عاقلانہ سرمایہ داری" (Rational Capitalism) قرار دیتا ہے۔ اس کے برعکس روایتی سماجوں کی سرمایہ داری کو وہ غیر عاقلانہ (Irrational) کہتا ہے عقلیت کے اس رجحان نے ہی قدروں سے آزاد، غیر شخصی ضابطوں پر مبنی نوکر شاہی نظام کو جنم دیا۔

گو کہ میکس ویبر نے قدروں سے آزاد، منضبط عقلیت کو جدید مغربی تہذیب کا ایک کارنامہ قرار دیا ہے لیکن بالآخر وہ بھی اس نتیجہ پر بھی پہونچا کہ یہ لوگوں کو کسی آہنی پنجرہ میں بند کر دینے کے مانند ہے کیوں کہ مادّی وحدانی تناظر سے اخذ کردہ اصول اتنے ہی بے رحم اور سنگ دل ہیں جتنے کہ روایتی سماج کے تصورات۔ مارکس اور درخیم کے برعکس جو عام تصورات اور عام قوانین پر زور دیتے ہیں ویبر کا یہ تصور ایک آزاد متبادل کی تلاش میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔

اسی طرح دوسری ٹکنالوجیوں کے بالمقابل، مثلاً چینی ٹکنالوجی اور خود مغربی ٹکنالوجی کی بعض شکلوں کے بالمقابل (مثلاً پن چکی اور ہوا چکی کی ٹکنالوجی کے مقابلہ میں) مغربی ٹکنالوجی کے خصائص کا پتہ لگایا جانا چاہئے۔ ایک مغربی مفکر کا خیال ہے کہ مغرب نے پن چکیوں اور ہوا چکیوں کے بجائے جس کی ٹکنالوجی موجود تھی، مشینوں اور پٹرول سے برقی قوت کے پیدا کرنے پر زور اس لئے دیا کہ اس کے

Marfat.com

پیش نظر استعماری عزائم تھے گوکہ پن چکیوں اور ہوا چکیوں کی ٹکنالوجی اس وقت زیادہ ترقی یافتہ اور متوازن تھی۔ لیکن اس کے بجائے متبادل راستے اس لئے اختیار کئے گئے کہ ان سے نوآبادیاتی علاقے کے وسائل پر قبضہ جمانے اور انہیں لوٹنے کے مواقع میسر تھے اور اس کے نتائج جلد برامد ہوتے تھے۔

مغربی علم کی سماجیات (Sociology of Western Knowledge)

آیئے ہم ایک سامنے کی بات سے ابتدا کرتے ہیں: کسی بھی عمل کو اس کی تمام پیچیدگی کے ساتھ نہیں سمجھا جاسکتا جب تک کہ اس عمل کو اس کے تاریخی وسماجی پس منظر میں نہ رکھ دیا جائے جس میں وہ تمام عناصر، تعصّبات، علامات، اور آرزوئیں شامل ہوں جن سے اس کی تشکیل ہوئی ہے۔ اس لئے اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر مغربی تصورات اور خیالات کا تجزیہ ان کی تمام پیچیدگیوں کے ساتھ کیا جائے تو ہم کو ان تصورات کو بہتر طریق پر سمجھنے میں مدد ملے گی۔ مثلاً مغربی تحریروں میں عام طور پر پائے جانے والے ایک تصور ''ایشیائی طریق پیداوار'' (Asiatic Mode of Production) کو ہی لیجئے۔ یہ عام اور بے حد مجرد تصور اس مرکزیت اور آفاقیت کا اظہار ہے جو مغرب نے اختیار کر رکھی ہے۔ یہ انداز نظر 16 ویں صدی میں پیدا ہوا اور 19 وی صدی کے آتے آتے اس نے واضح طور پر نسلی امتیاز یا نسل پرستی (Racism) کی شکل اختیار کرلی۔ جب مغربی مفکرین و مصنفین نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ مغرب، جو تہذیب یافتہ، منطقی، اور پیچیدہ تھا اس کے برعکس غیر مغرب (یا مشرق) جو غیر مہذب، غیر منطقی، اور غیر پیچیدہ تھا۔ علمیاتی سطح پر اس نسلی پرستی کا اظہار اس بچکانہ خواہش میں ہوا ہے کہ پوری دنیا کے لئے کسی استثناء کے بغیر ایک عام اور مجرد علمی نظام وضع کیا جائے۔ اسی خواہش کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ بعض معروضی اور سائنٹفک اصولوں کے ذریعہ حقیقت پر قابو پایا جاسکے تاکہ مرکزیت اور آفاقیت کے دعوں کا جواز ثابت ہوسکے۔

موجودہ مغربی فکر کے یہودی مآخذ

کچھ مغربی تصورات کی جڑیں مذہبی روایت میں اس طرح پیوست ہیں کہ ''معروضی'' محققین

Marfat.com

ومفکرین کے لئے بھی ان کا سراغ لگانا مشکل ہے۔ (مثلاً تاریخی ناگزیریت" Historical Inevitability کا تصور عیسائی تصور "الوہی تاریخ" Providential Hisotry کی ہی ایک سیکولر شکل ہے) تاہم اس سے قبل ہم موجودہ مغربی فکر کے یہودی مآخذ پر کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ مغربی افکار کے تمام محققین اس نکتہ پر متفق ہیں کہ مغرب کے یہودیوں نے مغربی تہذیب کے دائرے میں امتیازی درجہ حاصل کرلیا ہے۔ تاہم شائع شدہ ریسرچ میں جدید مغربی افکار کے "یہودی عناصر" کا کھل کر اعتراف نہیں کیا جاتا۔

یہودی عناصر سے یہاں ہماری مراد توریت یا تالمودی یہودیت سے نہیں ہے بلکہ یہودی تصوف کے سرّی نظام قبالہ سے ہے (بالخصوص ایزک لوریا کے لوریائی مقالہ سے جو گریشم شولیم کے بقول 16 ویں صدی عیسوی کی یہودی مذہبی فکر پر غالب رہا ہے)۔ قبالہ ایک وحدانی، ہمہ وقتی نظریہ ہے جس کی رو سے خالق اور مخلوق بہ تدریج ایک ہوجاتے ہیں اور ان کے درمیان کوئی جدائی نہیں رہتی۔ بنی نوع انسان، فطرت، اور خدا سب مل کر ایک ہوجاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہودی تصوف کا یہ باطنی نظام ہمہ اوست کی ایک انتہائی شکل ہے جو فی الحقیقت مادّی وحدانیت (materialistic monism) سے کسی طرح بھی مختلف نہیں ہے۔

یہودی قبالہ نظام کے پیروؤں نے سماوی اور تاریخی نظاموں کے متعلق اپنے نظریات وضع کئے۔ انسان اور اس کی حرکیت (Dynamics) کے بارے میں اپنے تصورات قائم کئے اور قبالی علامتوں کا ایک پورا نظام بھی وضع کیا۔ لوریائی قبالیت کا نتیجہ "جذبۂ مسیحائی" نامی عقیدے میں ظاہر ہوا جس کے مطابق ایک یہودی مسیحا کا ظہور بس ہونے ہی والا ہے۔ یہ عیقدہ جغرافیائی حد بندیوں کا مخالف ہے کیونکہ اس کے مطابق انسان (یا مسیحا) بے حدود ہے۔ اور بیشتر اپنے آپ کو ایسے اعمال میں ظاہر کرتا ہے کہ جو خدائی اور ازلی قوانین سے پرے ہوتے ہیں اور ان حدود سے بھی بلند ہوتے ہیں جن سے انسانی وجود عبارت ہے۔

Marfat.com

پہلے پہل تو یہودی علماء (ربیوں) نے قبالیت کے پیروؤں کی مخالفت کی اور ان پر نہ صرف توحید کی مخالفت بلکہ یہودیت کی مخالفت کے الزامات عائد کر کے ان کو دبانے کی کوششیں کیں۔ کچھ ربیوں نے یہ خیال تک ظاہر کیا کہ قبالیت کا جنم یہودی روایات کے اندر نہیں ہوا بلکہ اس کے ڈانڈے سلاو قبیلوں کے کاشتکاروں کی لوک روایات میں ملتے ہیں۔ یہ کشمکش کچھ عرصہ چلی لیکن بالآخر اس کشمکش میں قبالہ کو فتح حاصل ہوئی۔ توریت اور تالمود کی تفسیر قبالہ کے مطابق کی جانے لگی۔ یہاں تک کہ انہیں ہی معیاری تفسیر مانا جانے لگا۔ یہیں پر بس نہیں ہوا بلکہ ستم تو یہ ہوا کہ عیسائیوں کے درمیان بھی قبالہ فرقے کا ظہور ہو گیا اس کے نظریات عام ہونے لگے اور خاص طور پر عہد نشاۃ الثانیہ کے عیسائی مفکرین کے فلسفیانہ افکار میں سرایت کر گئے۔ قبالہ کو صرف رسمی طور پر ہی "عیسائی یا یہودی" قرار دیا جا سکتا ہے۔ ورنہ فی الحقیقت اس کے ہمہ اوستی نظریات مشرکانہ ہیں۔

عربی زبان میں قبالہ کا کوئی مطالعہ شائع نہیں ہوا۔ عیسائی تصورات کے بارے میں چند کتابیں تو شائع ہوئی ہیں لیکن ان تصورات کے زیریں نظریات، اور ان کے فلسفیانہ اور تاریخی پس منظر کا کوئی گہرا مطالعہ نہیں کیا گیا۔ خود مغربی علماء اور مورخین افکار کا قبالہ اور مسیحا کا مطالعہ ناکافی اور سطحی ہے ۔اور اس کا بھی زیادہ تر حصہ یہودی مطالعات (Jewish Studies) کے دائرے کے اندر ہی ہے۔ زیادہ تر علماء نے مسیحائی تحریکوں کا مطالعہ مغربی افکار کے حوالے سے نہیں کیا اور نہ اس امر کی تفتیش کی ہے کہ مغربی افکار پر ان کا کیا اثر پڑا ہے۔ اس لئے مغربی افکار کے یہودی عناصر ضمنی ہو کر رہ گئے ہیں اور ان کا بھرپور تجزیہ نہیں کیا گیا۔

ذیل میں ان چند مرکزی تصورات کی نشان دہی کی جاتی ہے جن کا اس ضمن میں تجزیہ کیا جانا چاہئے۔

(الف) بروچ اسپنوزا

مغربی افکار کے زیادہ تر مورخین اسپنوزا کو پہلا سیکولر مفکر قرار دیتے ہیں جس نے اپنے

Marfat.com

مذہب (یہودیت) سے بغاوت کی۔ اور کسی نئے مذہب کی بناء نہیں ڈالی۔ اس نے فطرت پرستی میں انتہا پسندی کی طرح ڈالی یہاں تک کہ فطرت کو دیو مالائی حیثیت دے دی اور خدا کو بھی فطرت کا ایک مظہر قرار دیا۔ اس کے افکار اور قبالہ افکار کے درمیان رشتوں کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ اس موضوع پر بعض مطالعے ضرور موجود ہیں لیکن انہوں نے صرف بالائی سطح کو ہی کھرچا ہے۔

(ب) سگمنڈ فرائڈ

تحلیل نفسی (Psychoanalysis)، اس کی علامات، اور انسانی جنسیات کی اہمیت پر اس کے زور کو صرف قبالہ نظریات کی روشنی میں مکمل طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ قبالہ کو ایسا انداز نظر قرار دیا جاتا ہے ''جس نے الٰہیات کو شہوانی بنا دیا اور شہوانیات کو الوہی درجہ دے دیا'' (Eroticized the Divine and divinized the erotic) فرائڈ کے نظریات کی یہ کوئی نامناسب ترجمانی نہ ہوگی اگر یہ کہا جائے کہ اس نے جنسی جبلت کو مادے کا ایک فطری پہلو قرار دیا۔ (جسم)

ذرا انسانی روح کی فرائیڈین درجہ بندی، ایغو (Ego)، بالائی ایغو (Super ego)، اور اِڈ (id) یا جبلت پر غور کیجئے۔ فرائیڈ کے عرب مترجمین کو اس بات کی طرف دھیان دینا تھا کہ اِڈ کا لفظ لاطینی id سے ماخوذ نہ ہو کر یہودی Yid سے بھی ماخوذ ہو سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ بھی قیاس ہے کہ یہ عبرانی لفظ Yesod (یسود) کی بازگشت ہے جس کے معنی ''بنیاد'' (Foundation) بتاتے ہیں اور جسے قبالہ نظام میں انسان (آدم) اور خدا کا وصف قرار دیا جاتا ہے۔ آدم کی بعض تصاویر میں یسود کی تصویر کشی مرد کے عضو تناسل کے طور پر بھی کی گئی ہے۔

اس کا مفہوم یہ ہوا کہ قبالہ نظریات کی رُو سے اِڈ (id) کائنات کی جنسی بنیاد ہے کہ اس مضمون پر کئی مطالعے کئے جا چکے ہیں۔ یہاں تک کہ یہودیت اور تحلیل نفسی (Judaism and Psychoanalysis) کے عنوان سے ایک علمی مجلّہ بھی شائع ہوتا ہے۔

Marfat.com

اس موضوع پر عالم عرب کے ایک اہم ماہر نفسیات صبری جرجس کی ایک تصنیف التوراث الیمودی والصہیونی فی الفکر الفرایودی قابل ذکر ہے۔اپنے موضوع کی ندرت اور عنوان کی جدت کے باوجود یہ کتاب نظر انداز کی گئی اور کسی اہم عالم نے نہ تو اس کتاب تائید کی اور نہ تردید۔

(ج) فرانز کافکا

کافکا کا شمار مغرب کے اہم ترین ناول نگاروں میں کیا جاتا ہے، اس کے مہمل، بے معنی، عدمیت اور تشکیک سے پُر رویہ کو عہد جدید میں مغربی تہذیب کے بحران کا نمائندہ سمجھا جاسکتا ہے۔کافکا کے فن اور فکر میں یہودی قبالہ کا طرز پوری طرح سے جھلکتا ہے۔

(د) ساختیات (Deconstruction)

موجودہ عہد میں ساختیات مغرب کے اہم طرز ہائے فکر میں سے ایک ہے۔اس طرز فکر کو اس کے بانی فرنچ فلسفی جیک دریدا (Jacques Derrida) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو اتفاق سے الجیریائی یہودی بھی تھا۔اس طرز فکر کا ایک اور نمائندہ مصری یہودی ایڈمنڈ گیبس (Edmund Gabes) ہے۔امریکا میں ساختیات کا علمبردار ہیرالڈ بلوم (Herald Bloom) بھی یہودی تھا۔ بلوم نے قبالہ اور تنقید (Kabbalah and criticism) کے عنوان سے نہ صرف ایک کتاب شائع کی بلکہ قبالہ کے موضوع پر ایک ناول بھی تحریر کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ساختیات اور مابعد جدیدیت کے عرب مفسرین کو ان فلسفوں کے یہودی پہلو اور اجزا نظر نہیں آتے۔گو کہ اس موضوع پر سموئیل ہیڈلیمن (Samuel Hadleman) کی کئی کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔

۷- دنیا کی تئیں کشادگی

ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم دنیا کی مختلف تہذیبوں کے تئیں کشادگی اور فراخ دلی کا رویہ اپنائیں اور ان کی تہذیبی وثقافتی روایات سے مستفید ہونے کے لئے تیار رہیں کیونکہ ان میں علم

Marfat.com

وحکمت کے ایسے خزانے پوشیدہ ہیں جن سے بنی نوع انسان، اس کے سماج اور فطرت کے بارے میں ہمارے فہم میں قیمتی اضافہ ہوسکتا ہے۔ نام نہاد عرب نشاۃ الثانیہ نے مغرب کے بارے میں خصوصاً انگلینڈ، فرانس، اور امریکا کے بارے میں خاصا فراخ دلی کا رویہ رکھا ہے لیکن اس کے برعکس، مشرقی یوروپی ممالک کے بارے میں ہمارا علم صفر ہے اور غیر مغربی ممالک اور ان کی تہذیبوں کو تو یوں نظر انداز کیا جاتا ہے جیسے ان کا وجود ہی نہیں مثال کے طور پر 19 ویں صدی اور اس سے قبل کی جاپانی معیشت کی ترقی کے بارے میں ہم کیا جانتے ہیں۔ جاپانی تہذیبی تناظر نے اپنے مغربی ہم پلہ سے ذرا مختلف راستہ اختیار کیا ہے اور اپنی جدیدیت کی تحریک میں بعض ایسے اجزاء شامل کیے ہیں جو جاپانی تہذیبی روایات سے اخذ کردہ ہیں بھلا ہم جاپان کی ادبی روایتوں اور تحریکوں کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ اگر ہمارے ادبی نقادوں اور مصنفین نے جاپانی کی ڈرامائی روایات کا مطالعہ کیا ہوتا، جو مغرب کی ڈرامائی روایت سے خاصی مختلف ہے۔ تو عرب تھیٹر کی کہانی آج بہت مختلف ہوتی۔ اگر انہوں نے ایسا کیا ہوتا تو شائد ان کو احساس ہوجاتا کہ ہماری بہت سی طویل لوک نظمیں بیانیہ ہونے کے بجائے ڈرامائی واقع ہوئی ہیں۔ اس طرح عرب تھیٹر کو اپنی ابتداء کے لئے ایک ایسا نقطہ مل جاتا جو محض مغرب کی نقالی پر منحصر نہ ہوتا۔

غیر عرب مسلم دنیا کے بارے میں بھی یہی دلیل دی جاسکتی ہے کہ ''سواحلی''، ترکی ''فارسی'' جیسی ''اسلامی'' زبانوں کا علم چند ماہرین تک محدود ہے۔ ان زبانوں کی ادبی، وثقافتی روایات اور تاریخ کے بارے میں بھی ہمارا مبلغِ علم مغربی مآخذ کا محتاج ہے۔ حالانکہ مسلم ممالک کی تاریخ، اپنے تنوع اور اپنی شان دار روایات کے باعث، اس کا امکان رکھتی تھی کہ صحیح معنوں میں ایک تکثیری تہذیب قائم کی جاسکے اور جس کا نتیجہ لازمی طور پر عدمیت اور لاتعینیت کے صحرا میں ظاہر نہ ہو۔

دنیا کی دوسری تہذیبوں کے بارے میں فراخ دلی کا رویہ اپنانے سے وہ علمیاتی خرابیاں بھی دور کی جاسکتی تھیں جو مغربی نوآبادیاتی نظام کے طویل دورانیہ کا نتیجہ ہیں۔ اور جس نے مغربی اندازِ فکر کی

Marfat.com

مرکزیت اور آفاقیت میں ہمارا یقین راسخ کر دیا ہے۔ نوآبادیاتی عہد میں ہمارے اسکولوں کے نصاب ازسرِ نو مرتب کیے گئے کہ ہمارے طلباء کو انقلاب فرانس کی تاریخ کے بارے میں تو علم ہو لیکن وہ عثمانی خلافت کی تاریخ سے بے گانہ محض ہوں۔ اگر عثمانی خلافت کا کوئی ذکر آتا بھی ہے تو صرف یوں کہ ''(یہ) مصر کے زوال کی ذمہ دار تھی''۔ مسلم فنون اور فلسفہ کے مطالعہ کی جگہ مغربی فنون اور فلسفہ کا مطالعہ رائج ہو گیا تا کہ تعلیم یافتہ نوجوان وان گاگ اور جین پال سارتر سے تو آگاہ ہوں لیکن عرب خطاطی، مسلم شہروں کی ساخت، اسلامی مخطوطات کے فنون، یا فارابی، ابن سینا، الغزالی، اور ابن خلدون کے کارناموں سے ناآشنا ہوں۔ حتیٰ کہ نوآبادیاتی فوجوں کے واپس ہو جانے کے بعد بھی مقامی دانش وروں اور سیاسی لیڈروں کے ذہنوں پر ''مغرب کی برابری'' کرنے کا بھوت مسلط ہے۔ چنانچہ وہ ہمہ وقت مغربی اقدار اور علم کے فروغ کے لئے کوشاں رہتے ہیں جب کہ خود ان کے علوم اور اقدار حاشیہ پر چلے گئے ہیں۔

ان زیریں تعصب کے وجود کے ادراک سے ہمیں کسی بھی ذریعہ سے حاصل ہونے والے علم کے بارے میں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ خواہ یہ علم مغربی تہذیبی روایات کے واسطے سے آئے ہمارے اپنے تہذیبی ذرائع سے۔ ہم کو اس زعم میں اسے آنکھیں بند کر کے نہیں قبول کرنا چاہئے کہ یہ ''آفاقی، فطری، سائنٹفک'' علم ہے۔ ہم کو یہ حقیقت ذہن میں رکھنا چاہئے کہ علم کائنات کے کسی پہلو کا ادراک حاصل کرنے کے لئے کئے جانے والی کُل انسانی کوشش کا نام ہے۔ یہ کوشش ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے گی کیونکہ انسانی ذہن محدود ہے اور اپنی ان حدود کے باعث وہ حقیقت اور کائنات کے تمام پہلوؤں کا مکمل ادراک کبھی نہیں کر سکتا۔ اس علم کے بعد کہ کوئی ایسا واحد، آفاقی، اور عام قانون نہیں جو کائنات کی وضاحت کر سکے۔ ہمیں اس علم کے زیریں علمیاتی اور فلسفیانہ نظاموں کی چھان بین کرنا چاہئے اس طرح ہم ان نظریات کے بارے میں امتیاز کر سکیں گے جو ہماری زندگی کو بہتری کی طرف لے جاتے ہیں یا اسے برباد کرنے کے سامان مہیا کرتے ہیں۔ اس طرح ہم ان حقائق کے جبر سے آزاد ہو سکتے

Marfat.com

ہیں۔جن کو حقیقت مطلق کہہ کر مسلط کیا جاتا ہے۔

زیریں تعصّبات کا علم حاصل کر کے ہم یہ جاننے کے قابل ہو سکیں گے کہ اپنے نظریات اور اپنے فلسفہ کے حق میں حقائق کو کس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔کس طرح معلومات کو غیر جانبدارانہ انداز میں جمع نہیں کیا جاتا بلکہ متعصّبانہ علمیاتی نظام کی بنیاد پر جمع کیا جاتا ہے۔ان تعصّبات کی بناء پر ہی فیصلے کئے جاتے ہیں کہ کن چیزوں پر دھیان دیا جانا ہے،کن حقائق کو شامل کرنا ہے۔کن حقائق کو تجزیہ سے باہر رکھنا ہے،کون سی باتیں مرکزی ہیں اور کون سی حاشیائی وغیرہ۔

Marfat.com

9
ایک مجوزہ متبادل علمیاتی نظام

زیریں علمیاتی تعصب کے وجود کے ادراک کا نتیجہ فلسفیانہ عدمیت کی صورت میں ظاہر نہیں ہوگا جو سائنس اور تاریخ کی موت کا اعلان کرتا ہے۔ تاہم تعصب کا خاتمہ ایک ایسے متبادل علمیاتی نظام کی شکل میں ظاہر ہونا چاہیے جس میں گذشتہ تمام انسانی تجربات سے استفادہ کیا گیا ہو (اس سے مغرب کے اخراج کی بھی ضرورت نہیں!) اور جو خود ہماری روایات کا آئینہ دار ہو۔ اگر کسی نظریہ کے زیریں علمیاتی نظام کی نشان دہی ایک مشکل کام ہے تو ایک متبادل علمیاتی نظام کی تشکیل مشکل تر ہے۔ یہ کسی فرد واحد کے بس کی بات نہیں۔ بلکہ اس کے لئے ایک ٹیم کی ضرورت ہے جو مختلف مراحل پر کام انجام دے (مثلاً مشاہدہ، درجہ بندی، تنقید، تجرید، تشکیل وغیرہ) اس کے بعد مشاہدہ کے ذریعہ ایک عارضی علمیاتی نظام ابھر سکتا ہے جس کا استعمال حقیقت کی وضاحت میں کیا جا سکتا ہے۔ ان تجارب کی روشنی میں اس عارضی علمیاتی نظام پر نظر ثانی کی جا سکتی ہے تاکہ اس کی وضاحتی قوت میں اضافہ ہو۔ بالآخر اس عمل کے ذریعہ ایک ایسا علمیاتی نظام وجود میں آسکتا ہے جس کا استعمال حقیقت کی وضاحت میں ''اعداد و شمار'' کے جمع کرنے میں، اور ان کی درجہ بندی میں کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ جمع شدہ اور درجہ بندی کئے گئے اعداد و شمار میں اختلاف ممکن ہے اس لئے اس مرحلہ پر ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ مغربی نظام کن اجزاء میں مفید ہے، کن میں اس کا اخراج ضروری ہے۔ اور کہاں اس کی حیثیت حاشیائی ہوگئی ہے۔

مجوزہ متبادل نظام کے خصائص

1-ہمارے اپنے ورثہ کی بنیاد پر قائم

متبادل نظام خود ہمارے اپنے تہذیبی ورثہ کی بنیاد پر قائم ہونا چاہئے۔ جب کہ ''ورثہ'' کی اصطلاح سے ہماری مراد کسی قوم کی پوری تہذیبی تاریخ سے ہے خواہ اس کا تعلق مادّی افعال سے ہو یا

Marfat.com

روحانی افعال سے۔ خواہ وہ ظاہر سے تعلق رکھتا ہو یا باطن سے۔ ہمارے ورثہ کو مذہبی کے بجائے ثقافتی مفہوم میں ''اسلامی'' قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں غیر مسلموں کے کارنامے بھی شامل ہو سکتے ہیں تاہم یہ بات واضح ہونا چاہیئے کہ اسلامی تہذیبی علمیاتی نظام کی بنیاد قرآن و سنت پر ہے۔ جو مطلق اقدار اور نسل انسانی کے ابدی سوالات کے جوابات کا مصدر و منبع ہیں۔

فقہ اسلامی ہمارے اجداد کی علمیاتی نظام کے فہم و ادراک کے لئے کی جانے والی کوششوں کا نتیجہ ہے بالکل اسی طرح جیسے ہمارے ہم عصر اسلامی مفکرین کی تحریریں ثقافتی نظام کے خصائص کے فہم و ادراک کی کوششیں ہیں۔ ''خود ہمارے ورثہ کی بنیاد پر قائم'' ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ محض گذشتہ کارناموں کی لفظی بازگشت ہے بلکہ مختلف اسلامی نصوص اور اعمال کی بنیاد پر نظام کے فہم و ادراک کی موجودہ اور پیہم کوششوں کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ اس طرح علمیاتی نظام اپنے آپ کو ثقافتی قواعد کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ جس کی روشنی میں قرآن اور سنت کے احکام کی تعبیر نو کی جا سکتی ہے اور پورے ثقافتی ورثہ کا از سرِ نو جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

2- ایک مکمل نظریہ کی طرف

ہمیں ایک غیر معمولی، فراخ حوصلہ، مکمل اور عظیم نظریہ کی بے حد ضرورت ہے۔ مغربی فلسفہ (اور اس مادّی انداز فکر میں) ایک عظیم نظریہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ مکمل تیقن کے ساتھ تمام سوالات کے مکمل جوابات مل جائیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو فطرت پر ایک مستقل اور مطلق (استعماری) کنٹرول حاصل ہو جائے گا۔ جب بہ تدریج یہ معلوم ہو گیا کہ اس قسم کا مکمل کنٹرول حاصل ہونا محال ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے تو علمیاتی نظام میں عہد روشن خیالی کے خواب سے جدیدیت کے وعدوں اور بالآخر مابعد جدیدیت کی عدمیت کی طرف کا سفر شروع ہوا۔ مغربی فلسفیانہ افکار کا ارتقا جو جدیدیت کی ناکامی کا اعتراف ہے۔ کائنات پر مکمل کنٹرول حاصل نہ کرنے کے سبب مغربی تہذیب نے کائنات

Marfat.com

کے انتشار، اس کی لامقصدیت اور بالآخر نسل انسانی کی موت کا ہی اعلان کر دیا۔

تاہم ان دو انتہاؤں یعنی مکمل توضیح اور کائنات کی لامقصدیت اور موت کے اعلان کے درمیان جھولنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے برعکس ہم ایک نظریہ کامل (Comprehensive Theory) کی جستجو کر سکتے ہیں جس کا مقصد کامل توضیح یا مکمل تیقن نہ ہو۔ یہ ایک "عظیم نظریہ" نہیں ہوگا کیونکہ یہ مطلق نہیں ہوگا لیکن اس کو نسبتاً عظیم نظریہ قرار دے سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ انسانی امکانات کے دائرے میں ہی ہوگا۔

3-انسان: نقطۂ ابتداء

ہم اس دعویٰ سے ابتدا کرتے ہیں کہ بنی نوع انسان اس کائنات میں ایک مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ اور اُس کو اس اعلا منصب سے نیچے اتارنا (مثلاً اُس کو فطرت یا مادّے کی حیثیت دے دینا) تقریباً ناممکن ہے۔ انسانوں کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسانی ذہن کے مالک ہیں۔ انسانی ذہن کسی مشین کی طرح فطرت کو ریکارڈ نہیں کرتا بلکہ وہ تخلیقی تعامل کی سطح پر اس کا ادراک کرتا ہے۔ اس طرح انسانی ذہن فطرت کے قوانین سے قدرے آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ آزادی اسے اس قابل بناتی ہے کہ وہ فطری مظاہر کے بارے میں آزادانہ غور و فکر کر سکے، آزادی کے ساتھ اخلاقی انتخاب کر سکے اور ان انتخابات کی بنیاد پر عمل کر سکے۔ انسان وہ واحد مخلوق ہے جو یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ انسان صرف ظاہری شکل و صورت اور خارجی حقیقتوں سے زیادہ متاثر نہیں ہوتا، وہ ان کی حقیقت تک پہونچنا چاہتا ہے۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے زیادہ گہرائی میں جانے کی خواہش رکھتا ہے تاکہ وہ اصطلاحات، علامات، اور توضیحات کے اندرونی معانی دریافت کر سکے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ ہم سب مشترک انسانیت کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں نسلِ انسانی، دوسری مخلوقات کے برعکس، ایک آفاقی جینیاتی (Genetic) پروگرام کے تابع نہیں ہے کیونکہ وہ مختلف ثقافتی شناختوں کے مالک ہیں اور آزاد (انفرادی اور اجتماعی) شعور رکھتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی

Marfat.com

ایسی واحد مخلوق ہیں جنہیں آزاد، اخلاقی انتخابات کے ذریعہ اپنے آپ کو ماحول کے مطابق ڈھالنے کی آزادی دی گئی ہے۔ ان کا برتاؤ محض فطری یا مادی قوانین کا سادہ عکس نہیں ہے۔ کیونکہ وہ بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ چنانچہ فطرت اور مادّے کے درمیان وہ ایک علمیاتی خلاء کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ فطرت کا نامیاتی، جزولاینفک نہیں ہیں بلکہ وہ ایک ایسا حصہ ہیں جو اس سے علیحدہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس کا جزء ہونے کے باوجود اس سے آزاد بھی ہے اور خود مختار بھی۔ ہوسکتا ہے کہ بنی نوع انسان میں فطرت اور مادّے کے بعض خصائص موجود ہوں لیکن وہ کُلی طور پر مادّہ نہیں۔ وہ اس سے بلند اور ماورا ہے۔ اس لئے بنی نوع انسان کو مرکزِ کائنات اور دوسری تمام مخلوقات سے برتر خیال کیا جاتا ہے۔

4-غیر مادّی زمرہ

خالص مادّی نقطۂ نظر سے فطرت میں بنی نوع انسان کا ظہور، ایک کیمیاوی عمل کے نتیجہ میں اتفاق سے ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اتفاق کا مادّی قانون حتمی ہے۔ اس طرح فطرت اور انسان کے مابین دوئی کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ بنی نوع انسان اور مادّے کے درمیان کسی قسم کا کوئی خلاء باقی نہیں رہتا اور مادّی وحدانیت کی حتمی حکمرانی قائم ہوجاتی ہے۔ مغربی سائنس نے اسی وحدانیت سے جنم لیا ہے جو انسان اور بندر یا دوسری مخلوقات میں کوئی تمیز نہیں کرتی۔ یہ ان کے درمیان عدم مماثلت کے نکات کے بجائے مماثلت اور مشابہت کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ فطرت پسند مادّی وحدانی علمیاتی نظام انسان کو اسی سطح پر رکھتا ہے جس سطح پر دوسری فطری اور مادّی اشیاء ہیں جب کہ غیر مادّی علمیاتی نظام بنی نوع انسان کو ایک ممتازی مقام عطا کرتا ہے۔

اس بات پر قدرے حیرت ضرور ہوتی ہے کہ آخر صرف سادگی یا تجزیہ کی آسانی کی خاطر ایک ایسے نقطۂ نظر کو رد کیوں کردیا جائے جو انسان کو محض مادّے کی حیثیت دینے سے انکار کرتا ہے۔ بجائے اس کہ انسان اور فطرت کی دوئی کو رد کردیا جائے کیا یہ زیادہ مناسب نہیں ہوگا کہ مادّی نقطۂ نظر کو ہی رد کردیا جائے کیونکہ ایک علمیاتی نظام کی حیثیت سے اس کی وضاحتی قوت نہایت کمزور ہے۔ بالخصوص بنی

Marfat.com

نوع انسان کے معاملے میں۔ اس کے بجائے ہمیں ایسے علمیاتی نظام کی ضرورت ہے جو ماڈی نظام کی طرح پیمائشی (Quantitative) اور غیر ماڈی نظام کی طرح خصائص پر زور دینے والا ہو اور جس کو جزوی طور پر اور صرف جزوی طور پر ہی فطرت/ مادہ دوئی سے اخذ کیا گیا ہو۔ اس طرح کا علمیاتی نظام ہمیں یہ بتانے میں کامیاب رہے گا کہ کون سے افعال خالص ماڈی ہیں اور کون سے غیر ماڈی۔ ان زمروں کی غیر ماڈی ماہیت ہماری روزمرہ کی زندگی میں آشکارا ہوتی ہے لیکن محض ماڈی انداز نظر سے ان کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔

اس نقطۂ نظر سے غیر ماڈی زمرے، ماڈی زمروں کی تکمیل کرتے ہیں تنسیخ نہیں۔ غیر ماڈی زمروں کو فطرت/ مادہ کی دوئی میں نہیں سمیٹا جا سکتا۔ کیوں کہ وہ اپنی قوت اس سے حاصل کرتے ہیں جو فطرت سے بھی بلند ہے اور ہر شے کا ازلی اور آخری سبب ہے۔ باایمان حضرات اس قوت کو خدا کے نام سے پکارتے ہیں جو اس کائنات کا ماورائی مرکز ہے۔ جو ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے:

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْد۔ (سورہ ق:16)

ترجمہ: اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

جو ہمارا، ہماری دنیا، اور ہماری تاریخ کا خیال رکھتا ہے لیکن اس جیسا کوئی نہیں۔ خدا کا وجود ہی فطرت کی موجودگی، اور اس کے ماورا، قابل پیمائش اور ناقابل پیمائش کا ثبوت ہے۔ فطرت اور ماڈے سے الگ، انسان کا وجود، خدا کے وجود پر منحصر ہے۔ جیسا کہ ہم اس سے قبل بھی عرض کر چکے ہیں کہ بنی نوع انسان کو دوسری تمام مخلوقات سے امتیاز کی بناء پر ہی مرکز کائنات قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کی موجودگی فطرت و مادے کے تسلسل میں ایک خلاء کی مظہر ہے۔ خدا کا وجود ایک ناقابل تنسیخ دوئی کا مظہر ہے۔ یہ دوئی ہے خالق اور مخلوق کے درمیان۔ یہ دوئی اس بات کی ضامن ہے کہ خلا کبھی پُر ہونے والا نہیں اور نہ ہی بنی نوع انسان اور فطرت و مادہ کے درمیان پائی جانے والی دوئی کبھی ختم ہونے والی ہے۔ اسی لئے علمیات کے ایک ایسے توضیحی نظام کی ضرورت ہے جو بہ یک وقت ماڈی بھی ہو اور غیر ماڈی

Marfat.com

بھی۔ اگر خالق مخلوق کے درمیان کی دوئی ختم ہو جائے تو ہم ایک بار پھر مادّی وحدانیت کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں انسان کو فطرت/ مادّہ سے ممتاز کرنے والی دیواریں ڈھے جاتی ہیں اور فطرت/ مادّہ کی قطعیت کا نظام واپس آ جاتا ہے۔ اسی طرح ہم آزادی اور اخلاقی انتخابات کے دائرے سے بھی باہر نکل جاتے ہیں۔ خدا کی ماورائیت بنی نوع انسان کی انسانیت اور انسان کی فطرت/ مادّہ سے اوپر اٹھنے کی صلاحیت کی ضمانت ہے!

5- ایک تخلیقی (غیر اضافہ پذیر) نظریہ

ہمارا مجوزہ متبادل نظریہ تخلیقی ہے۔ اس کی بنیاد، جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا، ایک انسانیت پر نہیں ہے جس کو فطرت/ مادّے کی طرح تحلیل و تجزیہ کے تابع بنایا جا سکے بلکہ اس کی بنیاد انسانیت کے مشترکہ تصور پر ہے جو ایک امکانی تخلیقی قوت کی طرح تمام انسانوں میں مخفی ہے۔ اور مختلف زمان و مکاں میں مختلف تہذیبی شکلیں اختیار کر سکتی ہے۔ ان شکلوں کی کثرت انسانوں کو فطرت سے جدا کرتی ہے۔ ایک قوم کو دوسری قوم سے مختلف بناتی ہے۔ اور ایک فرد کو دوسرے فرد سے ممتاز کرتی ہے۔ اسی نظریہ کا ہم پلہ یہ قیاس بھی ہے کہ گو کہ ہم سب کی انسانیت کی ایک مشترک بنیاد ہے لیکن پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہے جب تمام انسان اور تمام تہذیبوں نے کسی ایک مشترک نقطہ کی سمت حرکت کی ہو۔ اس لئے یہ قیاس کہ کوئی ایسا عام قانون ممکن ہے جس کا اطلاق تمام بنی نوع انسان اور فطرت کے تمام مظاہر پر یکساں طور پر ہو سکے ایک بے ہودہ اور لچر خیال ہے۔ کیونکہ یہ بنی نوع انسان کے تاریخی اور تہذیبی وجود کی پے چیدہ ہیئت ترکیبی کی مناسب و معقول وضاحت کرنے سے قاصر ہے علم میں مسلسل اضافہ اور اجتماع کے تصور کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ ہم بالآخر ایک دن ''کامل حقیقت'' کے عرفان میں کامیاب ہو جائیں اور ''تاریخ کے خاتمہ'' (End of History) کے قریب پہونچ جائیں اور اس زمین پر ایک خیالی ٹکنالوجیکل جنت کی تعمیر ہو سکے۔ تاہم یہ تصور اپنے آپ میں ایک ناقص اور از کار رفتہ تصور ہے۔ یہ اشیاء کے چند محدود پہلوؤں کے لئے تو مفید اور کار آمد ہو سکتا ہے لیکن انسانی عمل کی وضاحت کے لئے بے کار ہے۔

Marfat.com

10
متبادل سائنس

ایک ایسی متبادل سائنس کا وجود یقیناً ممکن ہے جو اپنے مقدمات (Prermises) اور مقاصد میں مغربی سائنس سے مختلف ہو۔ اگر مغربی سائنس کا نچوڑ یہ ہے کہ انسان اور فطرت کے درمیان دوئی کا خاتمہ کر کے مادّی وحدانیت تک پہونچا جائے تو متبادل سائنس کا نچوڑ یہ ہوگا کہ خدا کی ایک پیچیدہ مخلوق کی حیثیت سے انسان اور فطرت کے درمیان دوئی کو بحال کیا جائے۔ اس ممکنہ متبادل سائنس کے بعض خصائص درج ذیل ہیں۔

1-غیر مکمل تیقن اور اجتہادِ مسلسل

مجوزہ متبادل سائنس ایک لچکیلے اور کھلے علمیاتی نظام میں عمل پذیر ہوگی۔ مغربی سائنس کی طرح اس کا مقصد یہ نہیں ہوگا کہ حقیقت کی وضاحت کرنے کے لئے بعض ایسے قوانین وضع کئے جائیں جن کا اطلاق ہر جگہ اور ہر کسی پر ہو اور جس سے معروضی حقیقت کی وضاحت ہو سکے۔ یہاں تک کہ ان معروضی جوابات کے لئے ریاضیاتی فارمولے بھی وضع کر لیے گئے۔ (بالآخر یہ سب کچھ انسان کو ''تاریخ کے اختتام'' تک لے گیا۔) متبادل سائنس نہ تو مکمل معروضیت کو اپنا مطحِ نظر بنائے گی اور نہ مکمل موضوعیت میں غوطہ زن ہوگی۔ معروضیت کا مطلب ہے کہ حقیقت کا وجود ذہن سے باہر ہے۔ اس عمل میں مشاہدہ کی جانے والی چیز کا تو وجود ہے لیکن مشاہدہ کرنے والے کا وجود غائب ہے۔ اس کا مفروضہ یہ ہے کہ ایک ایسے ذہن کا وجود ہے جو سب کچھ جان لینے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس کا یہ بھی گمان ہے کہ حقیقت آسان ہے اور اتنی آسان کہ اس کا مکمل ادراک ممکن ہے۔ اس نقطۂ نظر کے برعکس موضوعیت (Subjectivity) کا مفہوم یہ ہے کہ حقیقت کا وجود خود ذہن کے اندر ہے اور ذہن سے باہر کسی

Marfat.com

معروضی حقیقت کا وجود ہی نہیں۔ اس نقطۂ نظر کی ایک پیش قیاسی یہ بھی ہے کہ ذہن حقیقت کا ادراک نہیں کرسکتا اور نہ ہی حقیقت کا مکمل ادراک ممکن ہے۔ اجتہاد کا تصور مکمل معروضیت اور مکمل موضوعیت کی دو ناممکن انتہاؤں کے ایک درمیانی نقطہ جیسا ہے۔ اس کا ابتدائی مفروضہ یہ ہے کہ انسانی ذہن ہر چیز کا مکمل ادراک نہیں کرسکتا اور یہ کہ مکمل علم حاصل کرسکنے کے بلند بانگ دعوے نہ صرف یہ کہ ناکام ہونے والے ہیں بلکہ ایک طرح کی شیطنت کے پیداوار ہیں۔ اسی طرح یہ مکمل معروضیت اور غیر جانب داری کے دعووں کو بھی رد کرتی ہے کہ انسانی ذہن عام اور یکساں قوانین دریافت کرسکتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ تو یہی ہے کہ انسانی ذہن بہ یک وقت محدود بھی ہے اور تخلیقی بھی: محدود ان معنوں میں ہر حقیقت تک اس کی رسائی ناممکن ہے اور نہ اس میں ہر شئے کی وضاحت کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اور تخلیقی ان معنوں میں کہ یہ جن چیزوں کا ادراک واحساس کرتا ہے ان کو میکانیکی طور پر نہیں کرتا۔

انسانی حقیقت ایک ایسے پوشیدہ امکان سے مملو ہونے کے باعث جس کا مشاہدہ سائنٹفک طور پر ناممکن ہے۔ پے چیدگی اور وسعت کے لاانتہا امکانات سے بہرہ ور ہے۔ خدا کی ہر مخلوق، خواہ وہ بظاہر کتنی ہی سادہ اور آسان کیوں نہ لگتی ہو۔ پے چیدہ اور پر اسرار ہے۔ اور اس کا مکمل ادراک نہیں کیا جاسکتا۔ حتیٰ کہ ہر عمل کا ایک غیر مرئی پہلو بھی ہوتا ہے۔ غیر مرئی کا مفہوم یہاں پر یہ ہے کہ ہر عمل کے کچھ ایسے پہلو ہوتے ہیں جو نہ مکمل طور پر قابل پیائش ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی وضاحت قانونِ تعلیل (علت ومعلول) کے ذریعہ ممکن ہے۔ اسرار کا یہ غیر مرئی پہلو جو لاعلمی کے اندھیروں میں مستور ہے اور جس کو جانا بھی نہیں جاسکتا نہ صرف تمام انسانی اعمال بلکہ کسی حد تک فطری اعمال میں بھی موجود ہے۔

چنانچہ متبادل سائنس کا علمیاتی نظام معقول حد تک علم حاصل کرنے کی جستجو کرتا ہے جس سے حقیقت کے تمام پہلوؤں کے بجائے چند پہلوؤں کی وضاحت کسی معقول درجہ تیقن کے ساتھ ہو سکے۔ ''معروضیت'' اور ''موضوعیت'' کے بجائے ''زیادہ تشریحی'' اور ''کم تشریحی'' جیسی اصطلاحات استعمال کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ اصطلاحات اس حقیقت کو ذہن نشین کراتی ہیں تمام انسانی علم میں موضوعیت

Marfat.com

(Subjectivity) کا عنصر موجود رہتا ہے۔ (تعصب کی ناگزیریت) اس کے ساتھ ہی یہ اصطلاحات حاصل شدہ علم کی افادیت کی توثیق بھی کرتی ہیں کیونکہ کسی خارجی حقیقت کے مقابل اس علم کو کسی معروضی کسوٹی پر کسا جاسکتا ہے ان فقروں میں پایا جانے والا علمیاتی نظام دونوں جانب سے کھلا ہوا ہے۔ یہ نظام علم کے حتمی یا آفاقی ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کا امکان تو ہمیشہ رہے گا کہ نئے علم اور حقیقت کے نئے پہلو دریافت کیے جائیں تاہم یہ ضروری نہیں کہ علم کی عدم تکمیل اور مکمل معروضیت کی عدم موجودگی کا خاتمہ عدمیت، انتشاریت، اور اضافیت پر ہو۔ کیونکہ ایک خدائے مطلق کی موجودگی میں اضافیت خود بھی تو اضافی چیز ہے۔ یہ تو صرف خدائے قدوس کی ذات ہے جو مادّے سے ماوراء ہے اور اس لئے مطلقیت کی حامل ہے۔

2- حقیقت پر مکمل اختیار کا امکان نہیں

مجوزہ متبادل سائنس کا مقصد یہ نہیں ہوگا کہ انسان حقیقت پر کسی قسم کا شاہانہ اختیار حاصل کرے۔ اور نہ ہی اس کا یہ مقصد ہوگا کہ سیارہ زمین یا اس کا کوئی جزو محض انسانوں کی خدمت کے لئے استعمال میں لایا جائے۔ (جیسا کہ مغرب کو اس زمین کے سیاہ و سفید کا مالک ہونے کا بھرم ہے)۔ متبادل سائنس یہ تسلیم کرے گی کہ تمام مخلوقات، انسان، چرند، پرند، حیوانات، حتیٰ کہ جمادات بھی اس وقار کے مالک ہیں جو اللہ عزوجل نے انہیں بخشا ہے۔ اسی نے ان کی تخلیق کی ہے، انہیں وجود عطا کیا ہے اس لئے متبادل سائنس کا عقیدہ یہ ہوگا کہ فطرت میں ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔ اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی یہ وسیع و عریض کائنات بے کار پیدا کی گئی ہے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّار (سورۃ آل عمران:191)

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار تو نے یہ بے فائدہ نہیں بنایا، تو پاک ہے پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے۔

انسان اس کائنات میں تنہا نہیں ہے۔ دوسری مخلوقات بھی اس میں اس کی شریک ہیں۔

Marfat.com

زمین بنی نوع انسان کو اس لئے نہیں عطا کی گئی کہ وہ اس کی تسخیر کرے۔ اور بغیر کسی لحاظ کے اس کا من مانا استعمال کرتا چلا جائے۔ بلکہ خالق نے اسے زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے۔ اس لئے وہ اپنی حدود میں رہ کر بھی اس کا استعمال کر سکتا ہے۔ اس زمین کی نگہداشت اور تحفظ بھی اسی کی ذمہ داری ہے۔

3- تجزیہ پسندی یا دوئی کا خاتمہ کی کوشش نہیں

متبادل سائنس اس قسم کی کوئی بھی کوشش نہیں کرے گی کہ حقیقت کو محض اس کے مادی ابعاد تک محدود کر دیا جائے اور نہ یہ کسی طرح دوئی کے خاتمہ کے لئے کوشاں ہوگی۔ کیونکہ یہ دوئی تو خالق اور مخلوق کے درمیان فرق کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ کُل کے مقابل جزو کو ترجیح نہیں دے گی۔ نہ ہی عدم تسلسل کے مقابل تسلسل کو ترجیح دے گی۔ کیونکہ نہ تو دنیا محض ایٹموں کا مجموعہ ہے جو بے ترتیبی سے ادھر اُدھر بکھیر دیئے گئے ہیں اور نہ ہی کوئی نامیاتی مجموعہ ہے جس کے تمام اجزاء سلیقے سے ایک دوسرے سے پیوست ہوں۔ اس کائنات کا مرکز اور اس کے اتصال کا منبع اس کے خارج میں واقع ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہ ایک غیر نامیاتی شے ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے اجزاء بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے کہ کُل۔ عدم تسلسل، تسلسل سے کم ضروری نہیں، اور خاص بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ عام۔

متبادل سائنس کسی عمل کی خاص خاص باتوں کا پتہ لگانے کی کوشش کرے گی۔ وہ خاص اور عام پہلوؤں کے درمیان تعلق کی تفتیش کرے گی۔ وہ کسی ایک پہلو کو دوسرے پر یا تسلسل کو عدم تسلسل پر ترجیح دینے کی کوشش نہیں کرے گی۔ وہ ایک مرکزی نقطہ پر پہونچنے کی کوشش کرے گی جہاں ایک عمل کا رشتہ دوسرے عمل سے قائم ہوتا ہے لیکن پھر بھی ممتاز رہتا ہے۔ خاص وعام، جزو کل، اور تسلسل وعدم تسلسل کی دوئی، انسان وفطرت کے درمیان دوئی کی بازگشت ہے (جو کہ دراصل خالق ومخلوق کے درمیان دوئی کی بازگشت ہے) متبادل سائنس کے نقطہ نظر سے اس دوئی کا خاتمہ مقصود نہیں ہے۔ عملی سطح پر اس کا مفہوم یہ ہوا کہ ریاست کے مقابل افراد اور چھوٹی سماجی اکائیوں کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا۔ حال کی

Marfat.com

خاطر ماضی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور فطرت کو انسان پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

4-وحدانیتِ تعلیل کا رد

متبادل سائنس مادّی اور تعلیلی وحدانیت کے تصور یا کسی بھی قسم کی جبری وحدانیت پر منحصر نہ ہوگی۔ اس لئے علوم کی وحدت (وحدانیت) کا تصور بھی اس کے لئے قابل قبول نہ ہوگا۔ اس کے برعکس وہ اس نکتہ پر زور دے گی کہ فطری اعمال کے لئے ایک سائنس ہو اور انسانی اعمال کے لئے دوسری۔ گو کہ ان دونوں کے درمیان بھی مکمل اور مستقل علیحدگی مقصود نہیں۔

تعلیلی وحدانیت (Causal Monism) کے بجائے متبادل سائنس تعلیلی تکثیریت (Causal pluralism) میں کام کرتی ہے۔ یعنی متبادل سائنس یہ سمجھتی ہے کہ فطری اور انسانی مظاہر کا کوئی ایک واحد سبب ہونے کے بجائے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ یہ خیال اس قیاس سے پیدا ہوا ہے کہ فطری اور انسانی اعمال کو زیادہ پے چیدہ سمجھا جاتا ہے۔ اور غالباً اس کی تخفیف محض مادّی اسباب سے کرنا ممکن نہیں ہے۔

اس لئے فطری اور انسانی اعمال کو یک رخا سمجھنے کے بجائے ان کی کاملیت میں، مختلف ابعاد کے ساتھ دیکھنا چاہئے۔ ان کے اہم پہلوؤں کو اسباب کے کسی ایک نظام میں رکھنا ممکن نہیں۔ اور نہ ہی کسی ایک (مادّی) سبب کو دوسرے اسباب پر ترجیح دی جانی چاہئے۔

5-اصطلاحات کا مسئلہ

(الف) اب تک جو معروضات پیش کی گئی ان کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض نئی اصطلاحات کی ضرورت ہے۔ فطرت/انسان کے درمیان دوئی کا تقاضا ہے کہ فطری علوم اور انسانی علوم کی اصطلاحات میں امتیاز قائم کیا جائے۔ ہم کو نامیاتی استعارات کے استعمال سے جہاں تک ہو سکے گریز کرنا چاہئے۔ کیونکہ نامیاتی استعاروں کے پس پشت یہ مفروضہ ہے کہ اس کائنات کا ایک نامیاتی وجود ہے۔ جس میں اس کے اجزاء کل کے ساتھ گھل مل گئے ہیں اسی

Marfat.com

طرح خاص وعام سے امتیاز کرنا مشکل ہے، یہ تمام قیاسات اس مفروضہ پر قائم ہیں کہ فطرت/ماڈہ کو کائنات میں مرکزیت حاصل ہے۔ان اصطلاحات سے گریز اس لئے بھی ضروری ہے کہ یہ انسان کو فطرت/ماڈے کی سطح پر لے آئی ہیں۔

(ب) ان نئی اصطلاحات کے لئے درستگی (Accuracy) اور صحت (Precision) پر اتنا اصرار نہیں کیا جانا چاہئے جتنا اس خاصیت پر کہ نئی اصطلاح پے چیدگی (Complexity) کو ادا کرنے کے قابل ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں پے چیدگی ناگزیر طور پر نادرستگی (Imprecision) کی طرف لے جائے گی۔اس کے برعکس، اس کا مطلب یہ ہے کہ عمل کی پیچیدگی اور اسکے مختلف ابعاد سے آگاہ ہوا جائے اور اس کا احساس ہو کہ عمل کے بعض پہلوؤں کا ادراک ممکن ہے اور بعض کا نہیں۔

(ج) نئی اصطلاحات تجزیہ اور اظہار کے ذریعہ کے طور پر استعارات کے استعمال سے منکر نہیں۔ استعاراتی زبان محض ذریعۂ آرائش نہیں۔ بلکہ یہ ایک پے چیدہ طریقۂ اظہار ہے۔ جہاں ہماری روزہ مرہ کی زبان مطالب کی ادائیگی میں ناکام ہوجاتی ہے وہاں استعاراتی طریقۂ اظہار کام میں لایا جاتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔استعاراتی طریقہ زمانۂ قدیم سے زیر استعمال ہے۔مثال کے طور پر ''اقتصادی انسان (Economic Man) اور یوروپ کا مرد بیمار (Sick Man of Europe) کی اصطلاحیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جنہیں پے چیدہ مطالب کی ادائیگی کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

(د) نئی اصطلاحات کی ساخت میں ''درمیانی اصطلاحات (Middle term) کا شامل کیا جانا ضروری ہے۔درمیانی اصطلاح اس امر کا اظہار اور اعتراف ہے کہ حقیقت کسی قوس قزح کی طرح پے چیدہ اور رنگا رنگ ہے جو مختلف رنگوں کے امتزاج سے وجود میں آتی ہے۔ان رنگوں کے درمیان کئی ایسی جگہیں ہوتی ہیں جہاں یہ پتہ نہیں چلتا کہ ایک رنگ کب ختم ہوا اور

Marfat.com

دوسرا کب شروع ہوا۔ ابتدا، درمیان اور انتہا کے مراحل محض تجزیاتی سہولت کے لئے اختیار کئے جاسکتے ہیں۔ ان سے واقعی مراحل مراد نہیں۔ اس طرح بعض نقطہ ہائے شدت (Intensity points) کی نشان دہی بھی کی جاسکتی ہے جو درمیانی یا آخری مرحلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوں۔ جب کہ ابتدا اور انتہا کے درمیان کچھ سرحدیں آپس میں گنجلک ہوسکتی ہیں۔

(ہ) اصطلاح کی عام سطح بہت احتیاط سے طے کی جانا چاہئے۔ اگر اس سطح کو بلند کرنا مقصود ہو تو ریاضی، الجبرا اور اقلیدس کا استعمال ناگزیر ہے۔

(و) کسی اصطلاح کی صحت اور اس کے جواز کا انحصار اسی کی وضاحتی قوت (Explanatary power) پر ہوگا۔ اس لئے اس کی درستی یا صحت (Precision) پر اصرار نہیں کیا جانا چاہئے۔

(ز) ان مجوزہ اصلاحات کے نتیجہ میں تحلیل و تجزیہ کے نئے میدان کھل سکتے ہیں۔ اور اجتہاد کا دروازہ کھل سکتا ہے۔ مثلاً سیاسی تجزیہ کے لئے "خاندان" کی اکائی "ریاست" سے کسی درجہ میں کم اہم نہیں۔ اس طرح بعض مظاہر مثلاً "فلسطینی انتفادہ" کی تہذیبی اہمیت کو سمجھنا زیادہ آسان اور مکمل ہوسکتا ہے اگر اس کا ادراک بھی کرلیا جائے کہ ایک قانونی ریاست کی عدم موجودگی میں خاندان بہت سے معاشی اور سیاسی افعال انجام دینے لگا ہے جو ریاست انجام دیا کرتی تھی۔

Marfat.com

مطالعہ افکارِ مغرب

باب اجتہاد

علمیاتی تعصب کے مطالعہ کی ابتداء

مصنف

ڈاکٹر عبدالوہاب المسیری

مترجم

اوصاف احمد

عکس

AKSPUBLICATIONS

297.3
ع 57 ب
16155

Marfat.com